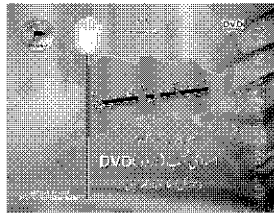


یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔



منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان



۷۸۶

۹۲-۱۱۰

یا صاحب الزماں اور کئی

DVD
Version

لبیک یا حسینؑ

نذر عباس
خصوصی تعاون: رضوان رضوی

اسلامی کتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری -

SABIL-E-SAKINA

Unit#8,

Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.

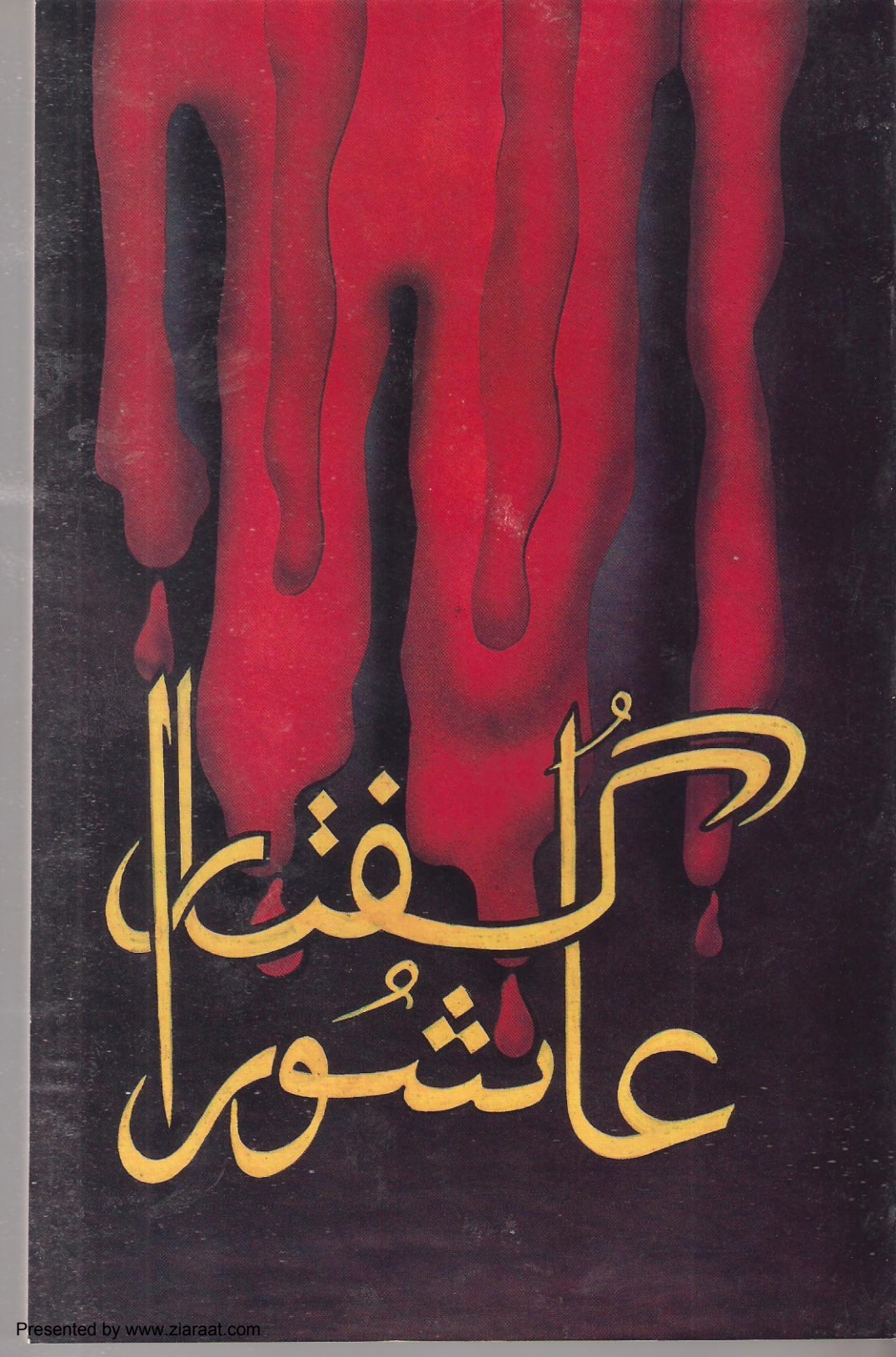
www.sabeelesakina.page.fl

sabeelesakina@gmail.com

Presented by www.ziaraat.com

www.ziaraat.com

NOT FOR COMMERCIAL



کشف
عاشوری

گفتارِ عاشورا

پہلے حصہ

آیت اللہ محمود موسوی طالقانی
آیت اللہ شیخ مرتضیٰ مطہری
آیت اللہ محمد حسین بہشتی
ڈاکٹر محمد ابراہیم آیتی

محمد علی علیہ السلام

جدو پبلشرز، آباد، پونٹ نمبر ۸-۶۱

جامعہ تعلیمات اسلامی

پوسٹ بکس نمبر ۵۲۲۵ کراچی پاکستان

کُفْتَارِ عَاشُورَاءِ

ترجمہ ————— مستجاب احمد انصاری

تدوین ————— رضا حسین رضوانی

مطبع ————— پرائیما پرنٹرز کراچی

طبع سوم ۱۹۹۹ء

**BOOK FAIR
IBNE ZEHRA
INSTITUTE**

جملہ حقوق محفوظ ہیں؛ یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ جامعہ بنڈا کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل تجارت یا کسی اور مفصل کی خاطر نہ تعاریتاً کرائے پر دیے جائیں گی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کی جائیں گی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنے والے پر یہ شرط عائد نہ کر نیکیے لیے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی۔
جامعہ تعلیمات اسلامی

کچھ اپنے باکے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید ابوالقاسم موسوی خونی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ تین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامیہ دنیا کے متعدد ممالک میں اسلامی علوم و معارف پر مشتمل معتبر اور مستند لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔

اس ادارے کا مقصد دور حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو اصلی اور محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرنا اور اس گمراہی پر علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیت رسولؐ نے ایک حدیث امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

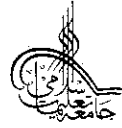
یہ ادارہ اب تک اردو، انگریزی، فرانسیسی، سندھی اور گجراتی زبانوں میں ۸۰ سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوب بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوس کتب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو بصراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ جامعہ کے زیر اہتمام چلنے والے ۲۰۰ سے زیادہ مدرسے گزشتہ سات برسوں سے قوم کے بچے بچیوں میں بنیادی اسلامی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جاسکے۔

دعا ہے کہ خداوندِ مہربان ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے!

تعاون کا طلبگار : (شیخ) یوسف علی نفسی نجفی

ونیسل حضرت آیت اللہ خونی دام ظلہ العالی



قارئین گرامی!

یہ کتاب ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی کی مطبوعات میں سے ہے۔ ادارہ مذاکی مطبوعات کی اشاعت کا مقصد دور حاضر کی روحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرز فکر کو اجاگر کرنا ہے۔

اس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اس کتاب کی تیاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو بہت گراں قدر ہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اسی نقطہ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔

آپ سے یہ بھی استدعا ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آراء تحریر فرما کر بھیجیں جو بڑی خوشی سے اور شکر کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اس کارِ نیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اس ارشادِ ربّانی کی تکمیل ہو سکے:

” (اے رسول!) کہہ دیجیے: میں تمہیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی خاطر اجتماعی یا انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو“

(سورہ سبأ - آیت ۴۱)

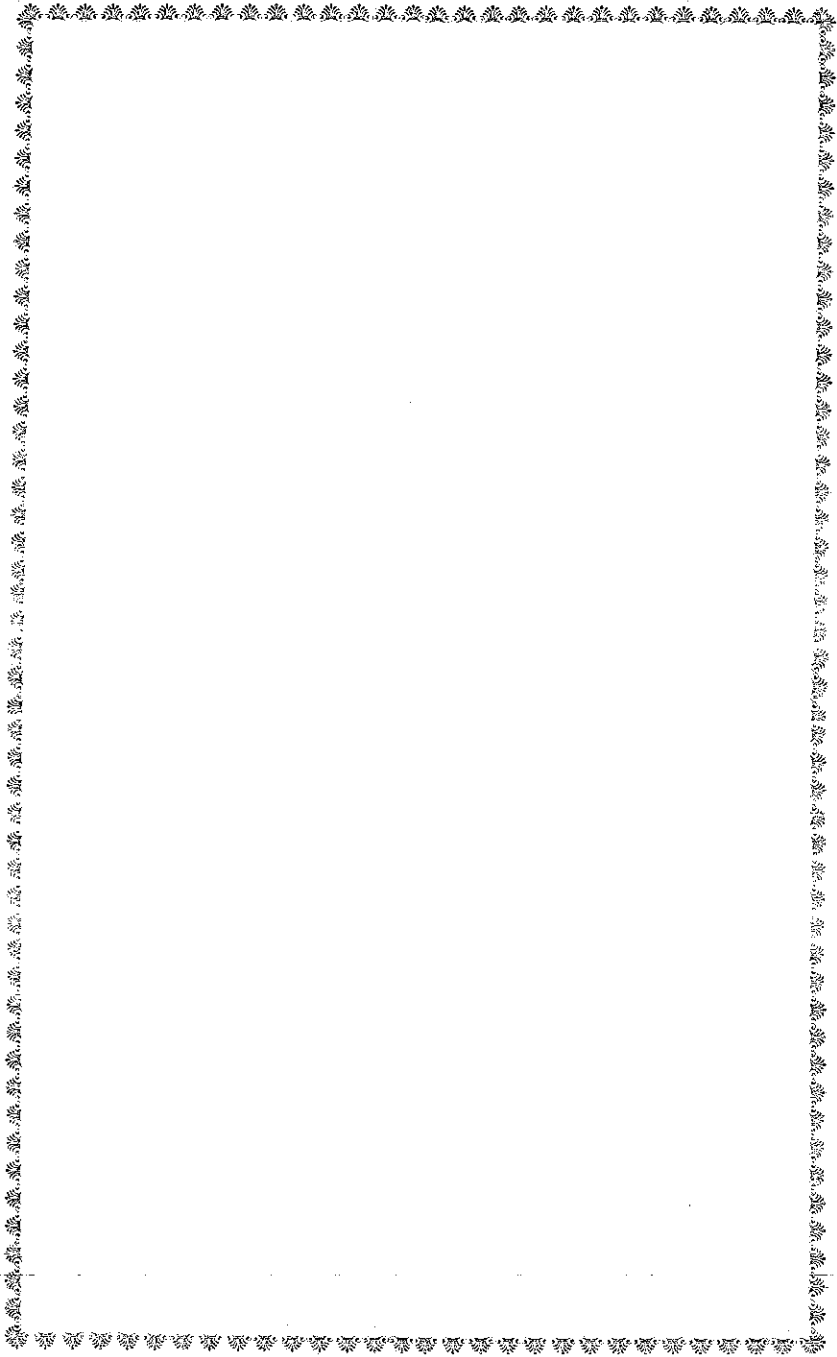
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔

تعاون کا طلبگار

سکرٹری نشر و اشاعت

فہرست

۷	پیش لفظ
۱۳	جہادِ حسینؑ کے اسباب
۴۷	کامیاب جدوجہد
۷۲	جہاد و شہادت
۱۲۱	امام حسینؑ کے قیام کے محرکات
۱۵۷	خطبہ اور منبر



أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ .
 أَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ .
 وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِنَا وَنَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَأَهْلِ الطَّيِّبِينَ الطَّاهِرِينَ وَصِحَابِ الْمَجَاهِدِينَ
 وَالتَّابِعِينَ لِرحمِ بِإِحْسَانٍ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ .

پیش لفظ

کربلا اسلام اور انسانیت کے لیے عظیم قربانی اور گراں قدر خدمات کے تسلسل میں اسلامی اقدار کی ایک روشن مثال پیش کرتی ہے۔ امام حسین، ان کے اہلبیت اور اصحاب علیہم السلام نے شہادت کی جو نظیر پیش کی ہے وہ عقول انسانی کو بالیدگی اور قلوب انسانی کو ایسی بلند پایہ اقدار فراہم کرتی ہے گی، جو انسان کو انسانیت کے اس بلند مرتبے پر فائز کر دیں، جس کی اللہ تعالیٰ ایک سچے مسلمان سے توقع رکھتا ہے۔

اسلام ایک دائمی تحریک اور دائمی انقلاب کا نام ہے جو نظریاتی میدان میں ایک مکمل نظام ہے اور تاریخی تسلسل کے سفر میں ایک زندہ تحریک ہے۔

نظریاتی طور پر اسلام کے ایک کامل نظام ہونے پر یہ آئینہ شریفی دلالت کرتی ہے :

” آج ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کاس کر دیا،
 تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو
 بحیثیت دین کے پسند کیا۔“ (سورہ مائدہ - آیت ۳)
 تاریخی تحریک کے میدان میں، اسلام کے دائمی تحریک ہونے پر یہ آیات
 شریفہ شاہد ہیں :

”مومنو! جتنی قومیں لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو
 کہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بُرائیوں سے روکتے ہو اور اللہ
 پر ایمان رکھتے ہو۔“ (سورہ آل عمران - آیت ۱۱۰)
 ”تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو خیر
 کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بُرائی سے روکے۔“
 (سورہ آل عمران - آیت ۱۰۴)

چونکہ اسلام کا روان تاریخ میں ایک دائمی تحریک اور ایک دائمی
 انقلاب ہے اس لیے وہ مسلسل قربانیاں پیش کرتا رہتا ہے۔ اس نے
 اپنی ابتدا سے کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے جاہلیت کی قوتوں اور
 اقدار کے مقابلے میں شہداء پیش کیے اور تکمیل دین کے بعد تحریف اور
 تخریب کی قوتوں کے مقابل اپنی مذکورہ کامیابی کی حفاظت کرنے کے لیے
 بھی مسلسل قربانیاں پیش کیں، ہر انقلاب میں شہداء کی تعداد بڑھتی
 چلی گئی اور ہر انقلاب کے مقابلے میں اس انقلاب کی اقدار اور اس کے
 مقاصد کی مخالفت اُبھرتی رہی جس کا ہڈ بھڑ یہ تھا کہ وہ اسے اور اس کے
 مستقبل کو تھس تھس کر دے۔ یہیں سے انقلاب دشمنی کے خلاف شہادت
 کی عظمت اُبھر کر سامنے آتی ہے کیونکہ یہ ان فاتحین کی شہادت ہے جو

فتح و نصرت کے اعزاز کے اسیر نہیں بنے بلکہ فتح پالینے کے بعد بھی اپنے موقف پر جمے رہے تاکہ شہادت جیسی عظیم نعمت سے سرفراز ہو سکیں۔

امام حسینؑ اسی فاتح گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور وہ فتح کے اعزازات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلامی معاشرے میں پُر آشائش زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن انھوں نے دیکھا کہ اسلام دشمن تحریک اسلام ہی کے بھیس میں پروان چڑھ رہی ہے، اسلام فکری جمود کا شکار ہو چکا ہے اور جیسے کہ رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا تھا، اسلامی خلافت قیصریت، کسراستیت اور جبارانہ شہنشاہیت میں تبدیل ہو گئی ہے۔

اسلام جو حسینؑ کی تصویر میں ایک دائمی انقلاب ہے، جسے ہمیشہ انحرافی تحریک، ملوکیت کے جمود اور تشدد کا ذریعہ بناتے جانے کے خطرات کا سامنا رہا، اس بات کا باعث بنا کہ امام حسینؑ اپنے لیے شہادت کی راہ کا انتخاب کریں تاکہ اسلام کی رُوح کی حفاظت ہو سکے اور اسے انحرافی تحریک کی آلودگیوں سے پاک رکھا جاسکے۔

اسلام جس کی خاطر امام حسینؑ نے شہادت پیش کی، ایک مہموم نظریہ نہیں بلکہ رُوئے زمین پر نافذ العمل ہونے والا ایک مکمل نظام ہے۔ وہ ایک ایسا مسلم معاشرہ تشکیل دیتا ہے جو لوگوں کی تمام ضرورتوں کی کفالت کرتا ہے، ان کے انسانی شرف کا تحفظ کرتا ہے اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کو سنوارتا ہے۔

امام حسینؑ اور ان کے ساتھی صرف قتل ہونے کے بعد ہی نہیں بلکہ زندہ ہوتے ہوئے بھی شہید تھے۔ شہادت فقط موت سے نہیں بلکہ زندگی میں بھی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ کسی عادلانہ موقف پر ڈٹ جانا، ذاتی،

خاندانی اور جماعتی خیالات سے بلند ہو کر پورے معاشرے کی فلاح کی خاطر ایک عادلانہ موقف اختیار کرنا، اسے پوری اُمت کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کا موقف بنادینا، تعلیماتِ الہیہ کے مطابق اس موقف کا رشتہ خدا سے جوڑنا اور سیاسی تقویٰ کے اصولوں پر کاربند رہنا ہی زندگی کو شہادت کے معنی پہناتا ہے اور یہی عمل موت کو شہادت کے زیور سے آراستہ کرتا ہے۔

مادی زندگی تو سب لوگوں کے لیے ہے لیکن شہید کا مستقبل انسان کے روحانی ارتقاء کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہی چیز انسان کو شہادت کا امتیازی نشان عطا کرتی ہے اور یہی شہدائے کربلا کے تقریب شہادت کی حقیقت ہے۔ یہ شہادت تاریخ کے صحن میں انسانی شرف کے دروازے سے داخل ہوتی ہے، فرقہ واریت، علاقائیت اور قومیت کے راستے سے نہیں۔ انسانیت کے دروازے سے اس لیے داخل ہوتی کہ یہ انسان جیسی صاحب شرف مخلوق کے موقف کی ترجمان تھی، وہی انسان جسے شرافت، سعادت اور بہتر مستقبل کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

”ہم نے بنی آدم کو شرف عطا کیا، انھیں بحر و بر پر تسلط بخشا، پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انھیں فضیلت دی“

(سورہ بنی اسرائیل - آیت ۷۰)

لہذا کربلا کی آفاقیت اور اس کی انسانیت ہی ہے جس نے اسے دوام بخشا اور یہ آج تک لوگوں کے ضمیروں، دماغوں اور خیالوں میں جاگزیں ہے اور ان کی رہنمائی ان اعلیٰ دینی اقدار کی طرف کرتی ہے جو انسان کو اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکال کر پورے معاشرے کی عزت، سلامتی اور

مستقبل کے لیے سعی اور عمل کے میدان میں لاکھڑا کرتی ہے۔

جیسے کہ رسول کریم نے فرمایا ہے :

”تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر شخص سے

اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی“

حُسنی انقلاب اور اُن کی آل و اصحاب کی شہادت کو جب ہم اس زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو عالم اسلام میں رونا ہونے والے واقعات کی حقیقت کو سمجھ جاتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ اب کہاں پہنچ چکا ہے اور اسے کون سے خطرات درپیش ہیں۔

کر بلا میں انسانیت کے نمایاں پہلو کے تحت آج بھی ہر انسان اور ہر جماعت کے لیے ایک کر بلا پناہ ہے۔ آج انسان ایک ایسے دور ہے پر کھڑا ہے کہ یا تو وہ عقیدہٴ توحید پر رہتے ہوئے اللہ کے بھروسے پر مشرق و مغرب سے منہ موڑ لے اور اپنے نفس کے خلاف جنگ کر کے تقرب الہی کی خاطر مستضعفین کی حمایت کرے، دین کی پاسداری کرے، اُتوت، محبت اور وحدت کو اپنا شعار بنائے اور اسلام کو سر بلند کرے یا پھر طغوت کے تابع فرمان ہو جائے، ظلم، خیانت، تعصب اور افراق کا راستا اپنائے۔ بہر حال ہم میں سے ہر ایک اپنی روش کے تعین میں اسی دور ہے پر کھڑا ہے۔

گزشتہ ادوار میں بہت سے لوگ اس دور ہے پر پہنچ کر ناکام ہو گئے لیکن آج اگر ہم ناکام ہو گئے تو یہ ہمارے دینی تشخص کی موت ہوگی کیونکہ ہمارے دشمن ہماری گھات میں ہے۔

شیخ محمد قہدی شمس الدین
نائب صدر المجلس الاسلامي الشيعي الاعلى (لبنان)

زندہ تقریریں

قارئین محترم !

زیر نظر کتاب میں جو تقریریں آپ پڑھیں گے وہ آج سے تقریباً
بیس پچیس سال قبل تہران میں عشرہ محرم میں کی گئی تھیں۔

ایسی ہی علمی اور انقلابی تقریروں نے ایران کے مسلمانوں میں
اسلامی فکر کو دوبارہ زندہ کیا اور ان میں ایک نئی روح بھونک دی۔

انہوں نے حضرت سیدالشہداء علیہ السلام کی ذات والصفات سے الہام
حاصل کرتے ہوئے جبر و استبداد اور عالمی استکبار کے خلاف تاریخی
جدوجہد کر کے ایک عظیم اسلامی انقلاب برپا کیا۔

درس گاہ کربلا کے سبق کو عام کرنے کے لیے اور حضرت سیدالشہداء
علیہ السلام کی تحریک کے مقاصد کو اجاگر کرنے کے لیے عشرہ محرم میں ایسی
ہی علمی اور انقلابی تقریروں کی ضرورت ہے تاکہ آج کے پر آشوب
دور میں اعلائے کلمۃ الحق کیا جاسکے !

۲۲ فروری ۱۹۹۰ء

جہادِ حسیني کے اسباب

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قَتَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا.
 بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ. (سورہ آل عمران ۱۶۹)

جیسا کہ آپ نے کل اور آج کے اخبارات میں ملاحظہ فرمایا ہوگا، آج کی تقریر کا موضوع، وہ اسباب ہیں جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کو قیام پر مجبور کیا۔ وہ کیا واقعات تھے جن کی وجہ سے امام حسینؑ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان حالات میں خاموش بیٹھنا گناہ ہے۔ میں گفتگو کے آغاز ہی میں یہ عرض کر دوں کہ یہ واقعات اچانک اور یک بارگی پیش نہیں آگئے تھے۔ یعنی ایسا نہیں ہوا تھا کہ معاویہ بن ابی سفیان کے بعد رجب ۶۰ھ ہجری میں یکایک اسلامی معاشرے میں ایسی کوئی تھام

صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی جس نے امام حسینؑ کو قیام پر مجبور کر دیا اور اس سے پیشتر اسلامی تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے اس صورتِ حال کا مقدمہ اور تمہید قرار دیا جاسکے۔ دراصل بات یہ نہیں ہے بلکہ امام حسینؑ کے قیام کے اسباب کی جستجو کم از کم تیس سال پہلے کی تاریخ میں کرنی چاہیے۔ یہ تو براہِ راست اسباب کی بات ہے۔ اگر بالواسطہ اسباب کی طرف بھی دھیان دیا جائے تو اس سے بھی پیچھے جانا ہوگا لیکن اس وقت بالواسطہ اسباب کا تذکرہ نہ مقصود ہے نہ ہی اس کا موقع ہے۔

بہر حال ۴۰ھ سے تیس سال پہلے یعنی ۲۹ھ یا ۳۰ھ ہجری میں اس مقدس تحریک کے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے عثمان بن عفان اموی نے تقریباً بارہ سال تک مسلمانوں پر حکومت کی اور اسلامی خلافت ان کے قبضے میں رہی۔ جیسا کہ آپ نے تاریخ میں پڑھا ہے، عثمانی خلافت کے آخری چھ سالوں میں اسلامی حکومت کی صورت بدل گئی تھی۔

اسلامی حکومت میں ہونا یہ چاہیے کہ اور سب معاملات میں تو لوگوں کو مکمل آزادی حاصل ہو، لیکن قاعدے قانون کی پابندی ہر شخص کے لیے ضروری ہو۔ حق کی پاسداری اور قانون کی پابندی کے سوا کوئی شخص کسی اور بات کے لیے مجبور نہ ہو سکتا کہ خود خلیفہ کی ذاتی اور شخصی خوشی کی رعایت کا بھی کوئی شخص پابند نہ ہو۔ حکومت کی یہی وہ صورت تھی جو بدل گئی۔ مسلمانوں کو قانون کی پابندی سے آزادی مل گئی اور اس کے بجائے ان کے لیے صرف خلیفہ کی خواہشوں اور مصلحتوں کا خیال رکھنا اور ان کا احترام کرنا ہی ضروری رہ گیا تھا۔

بہ الفاظ دیگر، اسلامی حکومت کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ ہر شخص کے لیے یہ لازمی ہو گیا تھا کہ وہ دربارِ خلافت کی مصلحتوں اور خواہشوں کے مطابق عمل کرے خواہ اس میں قانون کی خلاف ورزی ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔ جو شخص دربارِ خلافت کی خواہش کے خلاف قدم اٹھاتا تھا، وہ خواہ حق پر ہی کیوں نہ ہو اور قانون کی کتنی ہی پابندی کیوں نہ کرتا ہو اس کی گرفت کی جاتی تھی اور اسے سزا کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، عثمانی خلافت میں عثماریا سرکار کو سزا دی گئی، ابوذر غفاریؓ پر سختی کی گئی اور انھیں شہر بدر کر دیا گیا۔ وہ لوگ جو نہ صرف حق و انصاف کا لحاظ کرتے تھے بلکہ مذہب اور قانون کے نگہبان اور حلال اور حرام کا خیال رکھنے والے تھے اس لیے قید میں ڈالے جاتے اور تکلیف میں مبتلا کیے جاتے تھے کہ وہ خلیفہ اور دربارِ خلافت کے مفادات اور خواہشات کا خیال نہیں رکھتے تھے اور حق و انصاف کی خاطر خود خلیفہ کی ناراضگی کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس، جو لوگ دربار کے رُحانات اور خواہشات کا ساتھ دیتے تھے، نہ صرف یہ کہ ان کے اپنے حقوق محفوظ رہتے تھے بلکہ دوسروں کے حقوق بھی ان کی جیب میں چلے جاتے تھے۔

اسلام کی تاریخ میں یہ بات صاف اور عیاں ہے کہ عثمان بن عفان کی خلافت کے آخری چھ سالوں میں ان لوگوں نے جو عوام کے خیال کے مطابق جنتی تھے یتیموں اور بیواؤں کا مال غصب کر کے اس قدر دولت جمع کر لی تھی اور جائیدادیں بنالی تھیں کہ الامان و اکفیظ۔ جب ان لوگوں کا جو جنتی کہلاتے تھے یہ حال تھا تو پھر دوزخیوں کا جو حال ہو گا وہ ظاہر ہے۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے، غیر شیعہ ذرائع نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث روایت کی ہے، شیعہ اس حدیث کو قطعی دلائل کی بنا پر غلط اور موضوع قرار دیتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں یہ حدیث جو شیعوں کی نظر میں موضوع اور دروغ ہے، رسولِ اکرمؐ پر بہتان ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے دس صحابہ کو یہ بشارت دی تھی کہ ”تم جنتی ہو“

اب آپ دیکھیے کہ خلافتِ عثمان کے آخری چھ سالوں میں ان جنتیوں نے کیا مصیبت برپا کی، کس طرح املاک اور جائدادیں جمع کیں اور بیچارے عام مسلمانوں کے حقوق اور بیت المال کے اثاثوں میں کجا تصرف کیا۔ یہ وہی مال تھا جس کی علی بن ابی طالبؑ نے اپنے زمانہ خلافت میں سخت نگرانی کی تھی اور عثمان بن عفان سے پہلے دونوں خلفاء نے اور اپنے اوائلِ خلافت میں خود عثمان نے بھی ان کے خرچ میں خاص احتیاط کو ضروری سمجھا تھا۔

میں نے بطور مثال دورِ عثمان میں ان جنتیوں کے کچھ حالات تاریخ اسلام کے ایک اہم ماخذ سے نوٹ کیے ہیں جو میں آپ کو سناؤں گا تاکہ آپ کو بھی معلوم ہو جائے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ خدا نخواستہ جذبات یا مذہبی تعصب پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ ۲۹-۳۰ ہجری کے بعد آہستہ آہستہ جو واقعات پیش آئے ہم ان کا جائزہ لیں تاکہ وہ اسباب واضح ہو جائیں جن کی وجہ سے امام حسینؑ کا قیام ضروری ہو گیا اور جن کی بنا پر انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ حق سے انحراف کی یہ مصیبت جو تیس سال سے منڈلا رہی تھی اس کا علاج خونی جدوجہد اور شہادت سے

سرفرازی کے سوا کچھ نہیں۔ انشاء اللہ میری گفتگو سے یہ مضمون کافی حد تک واضح ہو جائے گا۔

جو لوگ تاریخ اسلام اور اس کے ابتدائی مآخذ سے واقف ہیں وہ مسعودی کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ علی بن الحسین المسعودی ایک معتبر اور قابل اعتماد اسلامی مؤرخ اور جغرافیہ داں ہے جس پر پانچوں اسلامی مکاتب خیال اعتماد کرتے ہیں۔ اس کی کتاب مروج الذهب دیکھ چسپ نہیں اور معتبر کتاب ہے۔

خلافت عثمان کے تذکرہ میں مسعودی لکھتا ہے :
 ”جب خلیفہ عثمان بن عفان قتل ہوئے اور انھوں نے دنیا سے رحلت کی تو ۵۰ ہزار دینار طلائی اور دس لاکھ درہم نقد چھوڑے۔ عثمان کے بعد علی بن ابی طالب خلیفہ ہوئے۔ جب انھوں نے شہادت پائی تو امام حسن نے منبر سے اعلان کیا کہ میرے والد نے سات سو درہم کے علاوہ ترکے میں سونے چاندی کا کوئی سکہ نہیں چھوڑا۔ یہ سات سو درہم بھی آپ نے اپنی تنخواہ میں سے اس لیے بچائے تھے کہ ان سے گھر کے کام کاج کے لیے ایک خادم کا انتظام کیا جاسکے“ لہ

لہ مروج الذهب مطبوعہ مصر ۱۹۲۸ء جلد ۲ صفحہ ۲۲۶
 ایک روایت ہے کہ امام علی نے اپنے خاندان کے لیے میراث میں ۲۵۰ درہم،
 قرآن اور تلوار چھوڑی۔

ادھر دیکھیے!

”ان لاکھوں درہم و دینار کے علاوہ وادی القریٰ اور
حنین وغیرہ میں جو جناب عثمان کی جائداد تھی اس کی
قیمت ایک لاکھ دینار طلائی تھی۔ اس کے علاوہ گھوڑوں
اور اونٹوں کی تو کئی گنتی ہی نہیں تھی۔“ لہ

حدیث عشرہ مبشرہ کے مطابق عثمان جنتی تھے حکومت اسلامی
کی سربراہی سے پیغمبر اسلامؐ تو دس روپے بھی جمع نہ کر سکے، علیؑ اور ابو بکر
وغمر نے بھی اس عہدے سے کوئی مادی فائدہ نہ اٹھایا، عثمان نے البتہ
اس سے خاصا فائدہ اٹھایا۔

یہی مسعودی لکھتا ہے کہ

”زیر بن العوام نے ایک مشہور محل بصرہ میں تعمیر
کرایا تھا۔ اس کے علاوہ بصرہ، کوفہ اور اسکندریہ (مصر)
میں ان کے اور بھی بہت سے مکانات تھے۔“

اس حدیث کے مطابق اور میرے الفاظ میں یہ زیر بھی جنتی تھے
زیر کا ترکہ پچاس ہزار دینار طلائی، ایک ہزار گھوڑے، ایک ہزار غلام
اور کئی زرے اور مختلف شہروں میں کثیر غیر منقولہ جائداد پر مشتمل تھا۔ یہ
قطعی بات ہے کہ اتنی دولت حلال اور طیب ذرائع سے حاصل نہیں کی جاسکتی
تھی، اس دولت کا بڑا حصہ ان محروم لوگوں کا حق تھا جو حکومت کے
زیر عتاب تھے۔ چنانچہ ان کا حصہ بھی یہ لوگ سمیٹتے چلے گئے۔

مسعودی مزید کہتا ہے کہ
 ”طلحہ بن عبید اللہ تیمی نے جو ایک اور جنتی تھے کو ذ
 میں ایک شاندار محل بنوایا تھا“
 غور سے سنیے!

مسعودی کہتا ہے کہ
 ”طلحہ بن عبید اللہ تیمی کی آمدنی صرف عراق کی جائداد
 سے ایک ہزار دینار طلائی تھی، بلکہ ایک روایت کے
 مطابق تو اس سے بھی زیادہ۔ مراثی کے علاقے کی آمدنی
 اس سے بھی زیادہ تھی۔ طلحہ نے مدینہ میں اپنا مکان پختہ
 اینٹوں، پونے اور بیش قیمت لکڑیوں سے بنوایا تھا۔“
 مسعودی آگے لکھتا ہے کہ

”عبدالرحمن بن عوف زہری نے جو ایک اور جنتی تھے
 ایک وسیع مکان بنوایا تھا۔ ان کے اصطبل میں سو گھوڑے
 تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس ایک ہزار اونٹ اور
 دس ہزار بھیڑ بکریاں تھیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جب
 انہوں نے دنیا سے رخصت کی، ان کے چار بیویاں تھیں“

اگر مرنے والے کی اولاد ہو تو اس کے مال کا آٹھواں حصہ اس کی
 بیوی یا بیویوں کو ملتا ہے، ایک بیوی ہو جب بھی آٹھواں حصہ اور اگر چار
 بیویاں ہوں جب بھی آٹھواں حصہ۔ عبدالرحمن بن عوف کی چار بیویاں
 تھیں، اس لیے ایک بیوی کا حصہ $\frac{1}{4}$ تھا۔ اس $\frac{1}{4}$ کے حساب سے
 ان کی ہر بیوی کو ۸۴ ہزار دینار طلائی ملے۔ سنا آپ نے! یہ بھی ایک

جنتی تھے۔

سعد بن ابی وقاص بھی جنتی تھے۔ مسعودی لکھتا ہے کہ
”انھوں نے ایک سرفنگک محل بنوایا تھا۔“ (یہ
سرفنگک تو میں نے کہا ہے، مسعودی کے الفاظ ہیں :
”بلند اور شاندار محل۔“)

زید بن ثابت البتہ ان جنتیوں میں شامل نہیں ہیں لیکن انھوں
نے بھی اپنے انتقال کے وقت اس قدر سونا چھوڑا تھا کہ ورثاء میں تقسیم
کرنے کے لیے ہتھوڑوں سے توڑنا پڑا۔ ان کی باقی منقولہ و غیر منقولہ جائداد
کی قیمت ایک لاکھ دینار تھی۔
مسعودی آگے لکھتا ہے :

”یعلیٰ بن امیہ (جن کو یعلیٰ بن منیہ بھی کہا جاتا ہے،
منیہ ان کی ماں کا نام تھا اور امیہ باپ کا۔ یہ صاحب
عثمانی دور خلافت میں اہم سیاسی اور انتظامی عہدوں
پر فائز رہے، آج کل کی اصطلاح میں وزیرِ مال تھے، یہ
بھی میری تعبیر ہے۔ مسعودی لکھتا ہے کہ یعلیٰ بن امیہ
نے مرتے وقت پانچ لاکھ دینار طلائی چھوڑے۔ اس کے
علاوہ لوگوں پر ان کا کثیر قرضہ بھی تھا۔ ان کی جائداد
اور دوسرے ترکہ کی قیمت تین لاکھ دینار تھی۔“
اس کے بعد مسعودی کہتا ہے :

”یہ بات عمر بن الخطاب کے دور میں نہیں تھی
بلکہ اس وقت کا طریقہ صاف اور واضح تھا۔“

آپ کو معلوم ہے کہ میں اور آپ شیعہ ہیں۔ تاہم سچی بات یہی ہے اور مسعودی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ، حکومت سے وفاداری کی صورت میں قانون کی یہ کھلے بندوں اور بے روک ٹوک خلاف ورزی کی اس حد تک اجازت دور عثمانی ہی میں شروع ہوئی۔ اگر کوئی شخص دربار کی خوشنودی حاصل کر لیتا تھا تو پھر قانون شکنی اور حدود سے تجاوز میں اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ غرض مسعودی کہتا ہے کہ

”عمر کے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔“ (یعنی طر حکومت اور جمع و تقسیم اموال کا طریقہ ایسا تھا کہ طلحہ ، زبیر ، سعد بن ابی وقاص اور دوسروں کی مجال نہیں تھی کہ وہ مسلمانوں کے اموال پر قبضہ کر کے اس قدر کثیر دولت جمع کر لیتے۔) ۱۷

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ، عثمان کے قتل کے بعد خلافت امیر المومنین امام علی علیہ السلام کو ملی۔ علی کے سامنے جو مشکل تھی وہ یہی تھی کہ لالچ ، طمع اور ان بڑی عادتوں پر جو پیدا ہو چکی تھیں کیسے روک لگائی جائے۔ علی اپنی خلافت کے چار سال اور چھ ماہ کے دوران میں اسی مشکل کا مقابلہ کرتے رہے ان کا مقابلہ ان ہی لوگوں سے تھا جو یہ چاہتے تھے کہ علیؑ کی خلافت میں بھی پہلے کی طرح دولت جمع کرتے رہیں۔ علیؑ کہتے تھے کہ یہ ناممکن ہے بلکہ اس سے پہلے تم نے جو مال بے جا طور پر اکٹھا کر لیا ہے میں وہ تم سے

واپس لے کر اسلامی بیت المال کو دے دوں گا۔ اسی قصبے میں بالآخر علی ابن ابی طالبؑ کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، امام علیؑ کے بعد خلافت امام حسنؑ کو منتقل ہوئی اور امام حسنؑ اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہو گا کہ امام حسنؑ کے زمانے میں مسلمانوں کی معاشرتی اور سیاسی حالت نے ایک خاص شکل اختیار کر لی تھی۔ اس وقت اگر امام حسنؑ معاویہ بن ابی سفیان سے جنگ جاری رکھتے تو کسی فریق کی جلد کامیابی کی امید نہیں تھی کیونکہ مسلمانوں کی طاقت دونوں محاذوں پر تقریباً برابر رہی ہوتی تھی ایسی حالت میں حسنؑ بن علیؑ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بے نتیجہ خون ریزی سے بچنے کے لیے جنگ سے دست کش ہو جائیں۔ اس بے نتیجہ خون ریزی کا فائدہ صرف مشرقی رومی سلطنت کو یا اندرونی طور پر خوارج کو پہنچ سکتا تھا۔ اگر معاویہ بن ابی سفیان سے جنگ جاری رکھ کر چار پانچ لاکھ مسلمان جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تو خدا ہی جانتا ہے کہ اس کے بعد مشرقی رومی سلطنت سے لڑائی میں مسلمانوں پر کیا گزرتی۔ خوارج کا خطرہ کیا صورت اختیار کرتا اور بعد میں اسلامی تاریخ کیا ہوتی یہ میری اپنی توجیہ ہے، آپ بھی اس پر غور کیجیے۔ اس وقت موصوٰی بن سفیان نے یہ بحث نہیں۔ اس لیے میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔

عرض امام حسنؑ خلافت سے کنارہ کش ہو گئے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھوں نے معاویہ کی اطاعت قبول کر لی تھی اور معاویہ کو خلیفہ اور امیر المومنین تسلیم کر لیا تھا۔

امام حسنؑ اور معاویہ کے درمیان جو صلح نامہ ہوا تھا اس کی ایک شق

یہ تھی کہ امام حسنؑ معاویہ سے صلح کرتے ہیں اور علیؑ کی اختیار کرتے ہیں اس شرط پر کہ حسنؑ بن علیؑ معاویہ کو ہرگز امیر المومنین نہیں کہیں گے۔ یعنی وہ معاویہ کو مسلمانوں کا خلیفہ اور امیر المومنین تسلیم نہیں کرتے۔ میں اس بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ میری نظر میں یہ معاملہ ایک قطعی دلیل ہے ان لوگوں کے خلاف جو یہ سمجھتے ہیں کہ امام حسنؑ نے معاویہ کی اطاعت قبول کر لی تھی، معاویہ کو مسلمانوں کا خلیفہ مان لیا تھا اور امام حسنؑ بھی معاویہ کی فرماں بردار رعایا میں داخل ہو گئے تھے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس قضیے کے متعلق ابن اثیر کی کامل التواریخ سے ایک اقتباس نوٹ کیا ہے، آپ بھی سنیے۔

ابن اثیر کامل التواریخ اور المسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ کا مصنف ہے۔ یہ دونوں کتابیں قابل قدر اسلامی تصانیف ہیں۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ

”جب حسنؑ بن علیؑ نے علیؑ کی اختیار کر لی اور معاویہ نے خلیفہ ہو کر معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تو فروہ بن نوفل اشجعی خارجی نے۔ جو اس سے قبل اپنے پانچسو آدمیوں کے ساتھ الگ ہو کر شہر زور چلا گیا تھا۔ کہا کہ اب اس میں شک نہیں رہا کہ حکومت وقت سے جنگ کرنا ضروری ہو گیا ہے معاویہ کے برتر اقتدار آنے اور خلیفہ بن جانے کے بعد جنگ ہمارے اوپر واجب ہو گئی۔ اس پر ان لوگوں نے عراق کا رخ کیا اور کوفہ کے نخلستان تک پہنچ گئے۔ امام حسنؑ اس وقت عراق چھو کر مدینہ کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ جب معاویہ کو خبر ملی کہ

یہ خارجی اپنے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ مکہ شہر اور بغاوت پر آمادہ ہے تو اس نے حسن بن علیؑ کے ساتھ صلح کو مزید مستحکم کرنے کے لیے (بخیاں خویش) امام حسنؑ کے نام ایک فرمان جاری کیا۔ یہ چٹھی اس وقت لکھی گئی جب امام حسنؑ عراق اور حجاز کے راستے میں تھے۔

معاویہ نے حسن بن علیؑ کو ہدایت کی کہ فروہ بن نوفل خارجی اپنے پانچ سو ہمراہیوں کے ساتھ کوفے کی طرف بڑھ رہا ہے لہذا تمہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ تم وہاں جا کر اس کا مقابلہ کرو اور اس سے کوفہ کا بچاؤ کرو اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ مدینہ روانہ ہو جاؤ۔ جب معاویہ کا یہ خط امام کو ملا، اس وقت وہ قادیسیہ میں تھے۔ امام حسنؑ نے اس کے جواب میں ایک جرات مندانہ خط لکھا تو لکھا جس کے الفاظ حیرت انگیز ہیں۔ آپ نے لکھا کہ

لَوِ اثْرَتُ اَنْ اُقَاتِلَ اَحَدًا مِّنْ اَهْلِ الْقِبْلَةِ
لَبَدَأْتُ بِقِتَالِكَ فَاقِي تَرَكْتُكَ لِصَلَاحِ الْاُمَّةِ وَ
حَقِّقِ دِمَائِهَا.

(اگر میں اہل قبلہ میں سے کسی سے جنگ کرنا چاہتا تو سب سے پہلے تم سے جنگ کرتا۔ میں نے تو تمہیں اہل بیت کی بھلائی اور اسے خود ریزی سے بچانے کے لیے چھوڑ دیا۔)

(الکامل جلد سوم صفحہ ۲۰۵ مطبوعہ مطبعہ منیرہ مصر)

اے معاویہ! تو چاہتا ہے کہ حسن بن علیؑ تیرے ایک افسر کی حیثیت

سے ایک خارجی کی سرکشی کو روکے، میں مسلمانوں کے مفاد میں خلافت سے دست بردار ہوا ہوں۔ اگر میں یہ چاہتا کہ اہل قبلہ یا بظاہر کسی مسلمان سے جنگ کروں تو پہلے تجھ سے جنگ کرتا۔ مطلب یہ ہے کہ تو سب مسلمانوں سے بدتر ہے۔

فَإِنِّي تَرَكْتُكَ لِصَلَاحِ الْأُمَّةِ وَحَقِّنِ دِمَائَهَا — تَرَكْتُكَ
 کے لفظ پر غور کیجیے۔ فرمایا فَإِنِّي تَرَكْتُكَ لِصَلَاحِ الْأُمَّةِ وَحَقِّنِ دِمَائَهَا
 یعنی میں نے تجھے چھوڑ دیا اور تجھ سے جنگ نہیں کی۔ مطلب وہی ہے جو
 میں نے عرض کیا اور یہی مطلب یہاں میری نظر میں بہترین ہے۔ یعنی
 میں دست بردار ہو گیا اور تجھے چھوڑ دیا اُمت کی بھلائی کے لیے اور اُمت
 کو غم ریزی سے بچانے کے لیے۔

اس کی وجہ یہ تھی، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ جنگ سے کوئی فائدہ
 نہیں تھا کیونکہ فریقین کی اسلامی فوجیں جو طاقت میں برابر تھیں اگر ایک
 دوسرے سے بھر پور ایک دوسرے کو قتل اور کمزور کرتیں تو دونوں ہی نابود
 ہو جاتیں۔ اس صورتِ حال سے صرف دشمن ہی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔
 یہی امام حسنؑ نے معاویہ کو لکھا تھا۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ امام حسنؑ کی شہادت کے بعد امام حسینؑ اس
 دس سال کی مدت میں جب ابھی معاویہ زندہ تھے یعنی ۴۹-۵۰ھ سے
 لے کر ۵۹ھ تک خاموش بیٹھے رہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس مدت میں امام
 حسینؑ نے معاویہ کے خلاف اس طرح تلوار اٹھانا ضروری نہیں سمجھا
 جس طرح یزید کے خلاف ضروری سمجھا۔ لیکن وہ معاویہ
 کی غلطیوں کی نشاندہی اور ان پر نکتہ چینی ضرور کرتے رہے جیسا کہ ان کے

بھائی امام حسنؑ نے ان فقروں میں جو آپ نے ابھی سُننے میں خلافتِ معاویہ کی حقانیت کا ابطال کیا تھا۔ سید الشہداءؑ نے بھی یہی کام کیا۔ اب ایک دو فقرے آپ کو ابنِ قتیبہ دینوری کے سُناتا ہوں، ابنِ قتیبہ سربراہِ ورہ علمائے اسلام میں سے ہیں اور قطعی طور پر سُنی المذہب ہیں شیعہ نہیں ہیں۔ ابنِ قتیبہ اپنی مشہور کتاب الإمامة و السياسة میں لکھتے ہیں :

”یہ وہ خط ہے جو امام حسینؑ نے معاویہ کو لکھا۔ (میں اس خط کے چند جملے عرض کرتا ہوں تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ حسین بن علی علیہ السلام کی روشِ معاویہ کے بارے میں کیا تھی اور کیا امام حسینؑ واقعی معاویہ کو ایک خلیفہ اور ایک قابلِ احترام اسلامی سربراہ تسلیم کرتے تھے؟ کیا اس دس سال کی مدت میں آپ نے واقعی معاویہ کی خلافت، حکومت اور سربراہی کو مان لیا تھا یا حقیقت وہ ہے جو ابنِ قتیبہ لکھتا ہے۔ اب میں اس خط کے چند فقرے نقل کرتا ہوں : امام حسینؑ معاویہ کو لکھتے ہیں :)

أَلَسْتَ قَاتِلَ حُجْرٍ وَ أَصْحَابِهِ
 الْعَابِدِينَ الْمُخْبِتِينَ الَّذِينَ كَانُوا يَسْتَفْظَعُونَ
 الْبِدْعَ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
 کیا تم نے حج اور ان کے ساتھیوں کو جو عابد و زاہد تھے، بدعات سے مُتَنَفِّر تھے اور اُمْر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے، قتل نہیں کیا؟ تم نے عہد و پیمان کرنے کے بعد

ازراہ ظلم ان کو مروا ڈالا، حالانکہ اس سے قبل تم نے ان کو امان دی تھی۔ یہ کام خدا کے حکم کے خلاف جرات اور اس سے کیے ہوئے عہد کی خلاف ورزی تھی۔ کیا تم نے عمرو بن العاص کو جو ایک بزرگ صحابی تھے قتل نہیں کیا؟ عمرو بن العاص وہ شخص تھے جن کے بدن کو عبادت نے گھلادیا تھا۔ تم نے ان کو امان دینے اور ان سے ایسے عہد و پیمانہ کرنے کے بعد ان کو قتل کیا، کہ ایسا عہد پیمانہ اگر آہوان صحرا سے بھی کیا جاتا تو وہ بھی پہاڑوں سے اتر آتے۔ کیا تم نے بناوٹ دعویٰ کرنے والے زیاد کو ابوسفیان کا بیٹا قرار نہیں دیا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ تھا کہ بچہ اس کا ہوتا ہے جس کے ہاں پیدا ہو اور زانی کی سزا یہ ہے کہ اُسے سنگسار کر دیا جاتے۔ پھر تم نے زیاد کو اہل اسلام پر مسلط کر دیا تاکہ وہ انھیں قتل کرے ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے اور ان کو کھجور کے درختوں پر لٹکا کر پھانسی دے۔ سبحان اللہ! معاویہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ تمہارا اس امت سے کوئی تعلق ہے اور نہ اس امت کا تم سے۔ معاویہ خدا سے ڈرو اور یہ سمجھ لو کہ اللہ کے پاس ایک کتاب ہے جس میں ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی ہے۔ معاویہ اچھی طرح سمجھ لو کہ خدا اس کو فراموش نہیں کر سکتا کہ تم محض بدگمانی سے ہی لوگوں پر (ہم) لگاتے ہو اور انھیں ناحق قتل کرتے ہو۔ اس سے

بڑھ کر تم نے ایک نادان اور ناتجربہ کار لڑکے کو امیر
 بنا دیا ہے جو شراب پیتا ہے اور گتوں سے کھیلتا ہے۔
 میرے خیال میں تم نے اپنے آپ کو غارت کر لیا ہے، اپنے
 دین کو کھو دیا ہے اور رعایا کو تباہ کر دیا ہے۔

والسلام

یہ تھا حسن بن علی اور حسین بن علی علیہما السلام کا معاویہ بن ابی
 سفیان سے طرزِ مخاطب اور اس کی حکومت اور سربراہی پر نکتہ چینی کا
 طریقہ۔ سید الشہداءؑ کے اس آخری فقرہ کی مزید وضاحت کے لیے جو
 انھوں نے یزید کو لکھا اور جس کا اسلام اور تاریخ اسلام پر نہایت گہرا
 اثر پڑا ہے علی بن الحسین مسعودی کا ایک اور فقرہ سنیے۔ وہ یزید کے
 متعلق کہتا ہے :

وَكَانَ يَزِيدُ صَاحِبَ طَرَبٍ وَجَوَاحِ وَكَلَابِ
 وَفُرُودٍ وَفُهُودٍ وَمَنَادِمَةٍ عَلَى الشَّرَابِ وَجَلَسَ
 ذَاتَ يَوْمٍ عَلَى شَرَابِهِ وَعَنْ يَمِينِهِ ابْنُ زِيَادٍ وَ
 ذَلِكَ بَعْدَ قَتْلِ الْحُسَيْنِ. فَأَقْبَلَ عَلَى سَاقِيهِ
 فَقَالَ.

یزید عیش پسند تھا، اس کے پاس شکاری جانور
 کتے، بندر اور چیتے تھے، اس کے یہاں شراب کی گھٹلیں

لہ الأمانة والسياسة جلد اول صفحہ ۱۹۰ تالیف ابن قتیبہ عبداللہ بن مسلم متوفی ۲۶۵ھ

مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ھ

جستی تھیں قتلِ حسینؑ کے بعد ایک دن شراب کا دور
چل رہا تھا، ابن زیاد یزید کی داہنی طرف بیٹھا ہوا
تھا، یزید نے ساقی کو مخاطب کر کے کہا ہے

أَسْقِنِي شَرْبَةَ تَرْوِجِي مَشَاشِي
ثُمَّ مِلْ فَاسْقِ مِثْلَهَا ابْنَ زِيَادٍ
صَاحِبَ السِّرِّ وَالْأَمَانَةِ عِنْدِي
وَلتَسْدِدْ مَغْنَمِي وَجِهَادِي

اے ساقی مجھے ایسا جامِ شراب پلا جو میری طبیعت
کو سیراب کرے۔ پھر ایسا ہی ایک جام ابن زیاد کو دے
جو میرا ہمراز اور مُقَدَّم ہے اور جو میری کامیابیوں اور
کوششوں کو مستحکم کرتا ہے۔“

اس کے بعد مسعودی یزید کے ظلم و ستم کا تذکرہ کرتے ہوئے
لکھتا ہے کہ

”وہ رعایا میں فرعون کی مثل تھا۔“

پھر کہتا ہے:

بَلْ كَانَ فِرْعَوْنَ أَعْدَلُ مِنْهُ فِي رِعِيَّتِهِ وَ
أَنْصَفَ مِنْهُ لِخَاصَّتِهِ وَعَامَّتِهِ.

بلکہ فرعون یزید سے زیادہ اپنی رعایا کے ساتھ
انصاف کرتا تھا اور عوام و خواص کے ساتھ اس سے

بڑھ کر انصاف پسند تھا۔ (مطلب یہ کہ فرعون اس سے بہتر تھا)۔“

اس کے بعد مسعودی کہتا ہے :

”یزید کی زیادتیوں اور بے باکیوں اور بے دینی سے عائشہ المسلمین بھی متاثر ہونے لگے تھے (کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بغولائے النَّاسُ عَلَى دِينِ مُلُوكِهِمْ جو گناہ یزید کرتا تھا وہی اس کے اکثر ارکان دولت کرتے تھے) وَفِي أَيَّامِهِ ظَهَرَ الْغِنَاءُ بِمَكَّةَ وَالْمَدِينَةَ اِسِي کے زمانے میں مکے اور مدینے میں گانے بجانے کا رواج ہوا (جب ارکان دولت اور خود خلیفہ نے گناہ کی راہ اختیار کر لی تو عوام بھی اسی راستے پر چل پڑے، مکے اور مدینے میں لوگوں کو گانے اور گانا سننے کی عادت پڑ گئی) وَاسْتَعْمَلَتِ الْمَلَاحِي هُوَ وَلَعِبَ كَاسَامَانَ ہونے لگا وَأَظْهَرَ النَّاسُ شَرْبَ الشَّرَابِ. لوگ عَلَى الْإِعْلَانِ شَرَابٍ يَبِينُ لَكُمْ (کیونکہ خود خلیفہ شراب نوش تھا) وَكَانَ لَهُ قَرْدٌ اِسِي کے پاس ایک بندر تھا (یعنی اس شخص کے پاس جو خَلِيفَةُ الْمُسْلِمِينَ کہلاتا تھا)۔

مسعودی کہتا ہے کہ

”یزید کے پاس ایک بندر تھا جس کی کنیت ابو قیس تھی، اس بندر کو شراب نوشی کی محفل میں لایا جاتا اور طشت میں اس کے لیے شراب ڈالی جاتی۔ یہ بندر

بہت خبیث تھا، اس کو ایک سدھائی ہونی بخگی گدھی
 پر سوار کر دیا جاتا جو گھڑ دوڑ میں حصہ لیتی، گدھی پر زین
 کس دی جاتی اور لگام بندر کے ہاتھ میں دے دی جاتی
 اور اس طرح ابوقیس کی گدھی دوڑ میں شریک ہوتی،
 کبھی کبھی یہ بندر دوڑ جیت جاتا، ابوقیس کو سرخ اور
 اور زرد ریشم کی قبا اور جامہ پہنایا جاتا، قبا کا دامن اس
 کی کمر سے باندھ دیا جاتا، اس کے سر پر رنگین ریشمی ٹوپی
 رکھی جاتی، گدھی کو بھی پھولدار رنگ برنگے کپڑوں سے
 آراستہ و پیراستہ کیا جاتا۔“

یہ ہے تفصیل اس جُملے کی جو سید الشہداء نے معاویہ کے نام اپنے
 خط میں یزید کے متعلق لکھا تھا۔

معاویہ کا انتقال ماہِ رجب سنہ ۶۰ھ میں ہوا اور جیسا کہ آپ کو
 معلوم ہے، یزید اس کا جانشین ہوا۔ میں نے کسی کتاب میں ایک عجیب
 فقرہ دیکھا، لکھا تھا کہ

”حسین بن علیؑ نے شہادت کیوں قبول کی اور یزید
 کی بیعت کیوں نہ کرنی؟ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ
 امام حسینؑ نے دیکھا کہ اگر وہ یزید کی بیعت کر لیں جب
 بھی قتل کر دیے جائیں گے اور نہ کریں جب بھی، لہذا
 انھوں نے سوچا، جب قتل ہی ہونا ہے تو کیوں نہ آبرو
 مندانہ طریقے سے راہِ خدا میں جان دوں۔“

یہ عجیب قسم کا بیان، بالکل بے بنیاد ہے۔ سید الشہداء کی شہادت

کا معاملہ اس سے بہت بلند ہے کہ جب انھوں نے دیکھا کہ تیل تو گر ہی گیا ہے، کہہ دیا کہ حضرت عباسؑ کی نذر ہے، جب انھوں نے محسوس کیا کہ ہر حال میں مارے ہی جانا ہے تو کہا عورت کے ساتھ کیوں نہ قتل ہو جاؤں، اسلام کی خاطر شہادت کا شرف کیوں نہ حاصل کر لوں۔ یہ بات درست نہیں۔ بلکہ حسین بن علی علیہ السلام نے ان حالات اور واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد جو کم از کم پچھبے تیس سال سے پیش آئے تھے یہ طے کیا تھا کہ حکومت اور مسلمانوں کا دین سے انحراف اس قدر شدید ہو گیا ہے کہ اس کا علاج و غلط و نصیحت اور تقریر کرنے یا کتابیں اور رسالے لکھنے سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ شدید انحراف ان طریقوں سے قابل اصلاح نہیں معمول اور خصوصاً انفرادی انحراف کا علاج تو مختصر تحریک، مختصر اقدام اور مختصر کوشش سے کیا جاسکتا ہے اور جھٹکے ہوئے کو راور است پر لایا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر انحراف شدید اور غیر معمولی ہو، اس کا ملت اسلامی کے بنیادی مسائل سے تعلق ہو اور خاص طور پر اگر وہ پھیل کر عام ہو جائے تو کسی معمولی تحریک یا عام تحریر و تقریر سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ امام حسینؑ نے پورا اندازہ لگالیا تھا کہ اب تک امیر المؤمنینؑ اور امام حسنؑ نے جو اقدامات کیے ہیں ان کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ایک تند و تیز قیام اور غیر معمولی "خونی تحریک" کو رواج دیا جائے کیونکہ اس کے بغیر معاویہ اور اس جیسے دوسرے لوگوں کی کارروائی کا توڑ کرنا ممکن نہ تھا۔ ظاہر ہے خود امام حسینؑ اپنے قیام کے اسباب جس طریقے سے بیان کر سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

میں نے امام حسینؑ کی تحریروں اور تقریروں سے مجموعی طور پر اور

خصوصاً ان کی ترتیب سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سید الشہداءؑ نے اپنی تحریک کی ابتدا میں اپنے اقدام کے اسباب اور اپنی تحریک کی فوج سے واقف کرانا شروع کیا۔

میں نے امام حسینؑ کی بعض تحریروں اور تقریروں کے اقتباسات نوٹ کیے ہیں جو میں آپ کے سامنے پیش کروں گا، اس ”وصیت نامے“ سے لے کر جو آپ نے مدینہ طیبہ میں اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کو لکھ کر دیا تھا، اس آخری، صاف اور غیر مبہم خطبے تک جو ”منزل بیضہ“ میں آپ نے حُر بن یزید ریاحی اور ان کے ساتھیوں کے سامنے پڑھا تھا جو میں انشاء اللہ آپ کو سناؤں گا۔ امام حسینؑ نے مسلمانوں پر واضح کر دیا تھا کہ اولاً؛ حکومت اسلامی نے جو رُجوعی اختیار کی ہے اور ثانیاً؛ مسلمانوں کے تمام اجتماعی معاملات میں جو رُخنہ پیدا ہو گیا ہے اس کا علاج شہادتِ جانبازی اور تند و تیز قیام کے بغیر ممکن نہیں۔

علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار کی جلد دہم میں مقتلِ محمد بن ابی طالب موسوی سے ایک روایت نقل کی ہے۔ محمد بن ابی طالب علمائے امامیہ میں سے ہیں۔ یہ روایت ممکن ہے اور کتابوں میں بھی ہو۔ اس روایت میں کہا گیا ہے کہ

”جب مدینہ کے گورنر نے امام حسینؑ پر یزید کی بیعت کے لیے دباؤ ڈالا تو آپ اس رات میں خاتم الانبیاءؑ کے مزار پر مسلسل تشریف لے جاتے رہے وہاں نماز پڑھی، دعا کی اور شاید وہیں سو گئے۔ دوسری رات میں بھی وہاں جا کر آپ نے چند رکعت نماز پڑھی

اور پھر آپ نے یہ فقرے کہے جن میں آپ نے اپنے قیام کے اسباب کی طرف اشارہ کیا: **اللَّهُمَّ هَذَا قَبْرُ نَبِيِّكَ**۔ اہی یہ تیرے نبی کی قبر ہے **وَأَنَا ابْنُ بِنْتِ نَبِيِّكَ**۔ اور میں تیرے نبی کا نواسا ہوں **وَقَدْ حَضَرْتَنِي مِنَ الْأَمْرِ مَا قَدْ عَلِمْتَ**۔ جو صورت حال مجھے پیش آئی ہے تجھے معلوم ہے۔“

یہ آخری جملہ اس کتاب میں ہے جس کا میں نے نام نہیں لیا اور نام لینے کی ضرورت بھی نہیں۔ ظاہر ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ یہ لوگ تجھے قتل کرنا چاہتے ہیں اور میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ قتل کے لیے تیار ہو جائیں مگر میں خود سے قتل پر رضامند نہیں ہوں لیکن میں ہرگز یہ پسند نہیں کروں گا کہ کوئی مسلمان اس جملے کا مطلب یہ نکالے کہ امام حسینؑ راہِ خدا میں شہادت کا خطرہ محسوس کر کے نالہ و فریاد کر رہے ہیں اور نبیؐ کی قبر پر مایوسی اور کمزوری کا اظہار کر رہے ہیں۔

مسلمانو! عمرو بن جموح ایک مسلمان تھا جو پہلے بت پرست اور دریائے کے ایک بت خانے کا کلید بردار تھا۔ یہ شخص سا لہا سال بت پرستی میں گزارنے کے بعد بڑھاپے میں مسلمان ہوا۔ جب یہ مسلمان ہو گیا تو اس نے اس درجہ روحانی ترقی کی کہ جب جنگِ احد کے لیے نکلا تو اس نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر کہا:

اللَّهُمَّ انزُقْنِي الشَّهَادَةَ۔ خدایا! مجھے شہادت نصیب کر۔ **اللَّهُمَّ لَا تَرُدَّنِي إِلَىٰ أَهْلِي**

حَاطِبًا. اَللّٰہی! ایسا نہ ہو کہ میں اس سفر سے زندہ ناکا
واپس آجاؤں۔“

جب اسلام ایک مسلمان کی روح کو جس کی ساری عمر
بت پڑتی میں گزری تھی اس قدر بلندی عطا کر دیتا ہے کہ وہ میدانِ جہاد
سے اپنے بیوی بچوں کے پاس زندہ و سلامت واپس آنے کو ناکامی اور
محرومی سمجھتا ہے تو پھر اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ امام حسینؑ اپنے
نانا کا دامن پکڑ کر فریاد کریں اور یہ کہیں کہ یا رسول اللہ! مجھے بچاتے لوگ
مجھے مارے ڈالتے ہیں۔ یہ معنی ہرگز نہیں۔

وَقَدْ حَضَرْتَنِي مِنَ الْأَمْرِ مَا قَدْ عَلِمْتَ - وہ پیغمبرؐ کی قبر پر
کہتے ہیں کہ یا الہی! جس صورتِ حال کا مجھے سامنا ہے تجھے معلوم ہے۔
وہ صورتِ حال وہی تھی جس کا امام حسینؑ نے اندازہ لگایا تھا۔ وہ صورتِ
حال وہ انسوؤں ناک کجروی تھی جس سے اسلامی معاشرہ دوچار تھا۔ اس
کجروی کا عمیق مطالعہ کرنے اور حکومت اور اس کے نظام کے تمام پہلوؤں
کا بغور جائزہ لینے کے بعد امام حسینؑ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قیام،
تحریک اور شہادت کے بغیر اسلامی معاشرے کو اس خطرے اور اس شدید
انحراف سے نجات نہیں دلائی جاسکتی۔

اس کے بعد امامؑ نے کہا:

”اللّٰهُمَّ إِنِّي أَحْبَبْتُ الْمَعْدُوفَ وَأَنْكَرْتُ الْمُنْكَرَ
(اس فقرے میں امامؑ مطلب سے زیادہ قریب آجاتے

۱۰ سیرت رسول اللہ ﷺ - الاستیعاب - أسد الغابہ - الإصابة .

ہیں مگر اب بھی یہ صورت ہے کہ عام لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں) اے اللہ! توجانتا ہے کہ میں نیک کاموں کو پسند کرتا ہوں اور بُرائیاں مجھے ناپسند ہیں۔ وَ اَنَا اَسْئَلُكَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ بِحَقِّ الْقَبْرِ وَمَنْ فِيهِ اِلَّا اَحْتَدَّتْ لِي مَا هُوَ لَكَ رِضًى وَ لِرِضْوَانِكَ رِضًى . اے ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ میری تجھ سے التجا ہے کہ اس مقدس قبر اور صاحبِ قبر کے طفیل میں، جو حالات تو نے میرے لیے پسند کیے ہیں ان کو اپنی اور اپنے رسولِ خاتم الانبیاءؐ کی خوشنودی کا ذریعہ بنا۔“

یہاں تک سید الشہداءؑ نے اتنا ہی ظاہر کیا تھا کہ میرے قیام کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے آپ کی مراد کیا تھی؟ شاید بعض لوگ آپ کا وصیت نامہ دیکھ کر یا یہ فقرے سن کر یہ خیال کریں کہ امام حسینؑ یہ چاہتے تھے کہ کوفہ جا کر وہاں کے اہلِ حرفہ اور نانباتیوں سے یہ کہیں کہ کم مت تولو، کوفہ کے تاجروں سے کہیں کہ سود مت کھاؤ۔ یہ تو ہونے لگی نہی عن المنکر۔ کوفہ کے جوانوں سے کہیں کہ نمازوں سے غفلت مت کرو۔ یہ ہوا امر بالمعروف۔ دراصل بات اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اس طرح کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو کوفہ کے واعظ بھی کر سکتے تھے۔ ابھی تک سید الشہداءؑ نے اپنا مقصد پوری طرح واضح نہیں کیا۔ بحار جلد دہم میں مقتلِ محمد بن ابی طالب موسوی سے منقول ہے کہ

جب سید الشہداءؑ مدینہ سے روانہ ہوتے لگے تو آپ

نے اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے نام یہ وصیت نامہ لکھا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هَذَا مَا أَوْصَى بِهِ الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ
إِلَى أَخِيهِ مُحَمَّدٍ الْمَعْرُوفِ بِأَبْنِ الْحَنْفِيَّةِ .

”یہ وصیت ہے حسین بن علی کی اپنے بھائی محمد
معروف بہ ابن حنفیہ کے نام“

مگر حسین بن علی کہنا کیا چاہتے ہیں ؟

”إِنَّ الْحُسَيْنَ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ

لَا شَرِيكَ لَهُ. حُسَيْنٌ بْنُ عَلِيٍّ كَوَّاهِي دِيْتَا بِي كَرِ اللّٰهُ خَر

لا شریک ہے اور اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وَأَنَّ

مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ جَاءَ

بِالْحَقِّ مِنَ عِنْدِ الْحَقِّ. اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں جو خدائے برحق

کے پاس سے دین برحق لائے ہیں وَأَنَّ الْجَنَّةَ حَقٌّ

وَالنَّارُ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا وَ

أَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ. جنت حق ہے اور

جہنم بھی حق ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامت

آنے والی ہے۔ اس روز اللہ تعالیٰ مردوں کو قبروں سے

نکال کر زندہ کرے گا اور ان کا حساب کتاب ہوگا۔“

اس کے بعد اصل مطلب کی بات آتی ہے :

وَإِنِّي لَمَّا خَرَجْتُ أَشْرًا وَلَا بَطْرًا وَلَا مُفْسِدًا

وَلَا ظَالِمًا مِمَّا مِيرَاقِيَامٍ اور اقدام معمولی نہیں۔ میری تحریک
خواہش نفسانی پر مبنی نہیں اور نہ میرا ارادہ کسی ظلم
کا ہے۔ وَاتَّمَا خَرَجْتُ لِطَلْبِ الْأَصْلَاحِ فِي أُمَّةٍ
جَدِّي مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ.

اس فقرے میں مزید صراحت ہے۔ کہتے ہیں کہ میں اپنے نانا کی
اُمت کی اصلاح کے لیے جا رہا ہوں۔ اس فقرے میں حسین بن علیؑ نے
یہ واضح کر دیا ہے کہ ایک خطرناک بگاڑ پیدا ہو گیا ہے جس کی اصلاح قیام
اور خون بہانے بغیر ممکن نہیں، فساد ایسا ہے کہ حسین بن علیؑ کے سوا کوئی
اس کی اصلاح نہیں کر سکتا، کبھی اس قدر شدید ہو گئی ہے کہ اس کا ہلکا
محض تقریروں، تحریروں، خطبوں اور نصیحتوں سے نہیں ہو سکتا۔ لیکن
اب بھی بات صاف نہیں ہوئی کہ امام دراصل کہنا کیا چاہتے ہیں۔

”وَ اتَّمَا خَرَجْتُ لِطَلْبِ الْأَصْلَاحِ فِي أُمَّةٍ
جَدِّي مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ. أُرِيدُ أَنْ أَمُرَّ
بِالْمَعْدُوفِ وَ أَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ. میرا ارادہ یہ ہے
کہ اس قیام کے دوران میں امر بالمعروف اور نہی عن
المنکر کروں وَ أَسِيرُ بِسِيرَةِ جَدِّي وَ أَبِي عَلِيِّ بْنِ
أَبِي طَالِبٍ اور اپنے نانا خاتم الانبیاءؑ اور اپنے والد زکریاؑ
علی بن ابی طالبؑ کے طریقے پر چلوں۔ فَمَنْ قَبِلَ بِقَبُولِ
الْحَقِّ فَإِنَّهُ أَوْلَى بِالْحَقِّ لِهَذَا جَوْشَخْصِ بِي حَقِّ كَوْبُولِ
کرے تو اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کیونکہ اللہ ہی
کو پسند کرتا ہے۔ وَمَنْ رَدَّ عَلَيَّ هَذَا أَصْبِرُ حَتَّى

يَقْضَى اللَّهُ بَيْنِي وَبَيْنَ الْقَوْمِ بِالْحَقِّ وَهُوَ خَيْرُ
 الْحَاكِمِينَ. وَهَذِهِ وَصِيَّتِي يَا أَحَى النَّيْكَ. وَمَا
 تَوَفَّقَنِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَالْيَهَّ أُنَيْبُ .
 لیکن اگر کوئی حق کو قبول نہ کرے تو میں پھر صبر کروں گا
 (لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے
 بیٹھا رہوں گا۔ یعنی اگر ضرورت ہو تو میں اکیلا ہی یہ راہ
 طے کروں گا) یہاں تک کہ اللہ میرے اور ان لوگوں کے
 درمیان حق کے مطابق فیصلہ کرے۔ وہی سب حاکموں
 سے بڑا حاکم ہے۔ یہ میری تمہیں وصیت ہے اور توفیق
 اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور
 اسی کے پاس واپس جانا ہے۔“

مجھے اپنی گزارشات پیش کرتے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا، وقت کا
 بھی خیال رکھنا ہے، بقیہ مضمون کسی اور مجلس میں پیش کروں گا۔
 علی بن عیسیٰ اربلی کی کتاب کشف الغمہ میں محمد بن طلحہ سے
 روایت ہے اور اسی طرح سید ابن طاووس کی کتاب لہوف میں منقول
 ہے کہ

”سید الشہداءؑ ماہ شعبان کی تیسری تاریخ کو مکہ میں
 آئے اور شعبان، رمضان، شوال، ذی قعد اور ذی الحجہ
 کی آٹھ تاریخ تک وہاں قیام کیا۔ (کوئی تصویر بھی نہیں
 کر سکتا تھا کہ فرزند پیغمبرؐ یکا یک آٹھویں تاریخ کو مکہ سے
 روانہ ہو جائیں گے اور حج کے اعمال انجام دیے بغیر وہ کر کے

اِحرام کھول دیں گے، جب آپ نے عراق جانے کا عزم
 کر لیا قَامَ حَطِيْبًا آپ نے ایک حُطْبِيہ دیا۔
 یہاں آپ کی توجُّہ کا طالب ہوں۔ شاید بہت سے لوگوں کے لیے
 سید الشہداءؑ کے ان فقروں سے جو آپ نے اس موقع پر فرمائے مقصد کا
 کچھ سراغ نکل آئے۔ آپ نے اللہ کی حمد و ثنا اور خاتم الانبیاءؑ پر درود
 کے بعد فرمایا:

”حُطَّ الْمَوْتُ عَلَىٰ وُلْدِ آدَمَ مَحَطَّ الْقَلَادَةَ
 عَلَىٰ جَيْدِ الْفَتَاةِ“

”موت نے بنی آدم کو اس طرح نشان زدہ کر دیا ہے
 جیسے کسی جوان عورت کی گردن پر گلوبند کا نشان پڑ جاتا
 ہے۔“

بات وہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، سید الشہداءؑ نے مکہ میں بات کو
 اور کھول کر بیان کر دیا اور لوگوں کو بتلادیا اس وقت کیا صورت ہے اور
 آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ گفتگو موت اور شہادت کی ہے جس سے قطعاً یہ
 بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ اُمتِ اسلامی کا بگاڑ اس حد تک سے تجاوز
 کر چکا ہے کہ جہاں روپیہ خرچ کرنے سے، تحریری خدمت سے، سوچ بچار
 یا اسی طرح کی کسی اور تدبیر سے یا مذہبی مجالس منعقد کرنے سے یا مذہبی
 تقریروں سے اس کی اصلاح ہو سکے۔ خود حسین بن علیؑ بھی اسی طرح کی
 کسی تدبیر سے اس شدید بگاڑ کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ حُطَّ الْمَوْتُ
 عَلَىٰ وُلْدِ آدَمَ اب تو اصلاح کا واحد راستا صرف شہادت ہی ہے، وہ
 بھی حسین بن علیؑ جیسی عظیم ہستی کی شہادت۔

اس خطبے میں ساری گفتگو شہادت ہی سے متعلق ہے، مرتے کی بات ہے، رسولِ خدا کے پاس جانے کی بات ہے، کربلا کے بھیڑیوں کے ہاتھ میں پڑنے کی بات ہے، اس سفر کی بات ہے جس کا انجام شہادت ہوگا۔ حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ امام حسینؑ نے غالباً یہ خطبہ ذی الحجہ کی ساتویں تاریخ کو مسجد الحرام میں اجتماع عام میں دیا تھا۔ اس وقت حالات بظاہر حسینؑ بن علیؑ کے لیے سازگار تھے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ جلد ہی یزید بن معاویہ خلافت سے علیحدہ ہو جائے گا، اس کا زوال ہو جائے گا اور خلافت حسینؑ بن علیؑ کو مل جائے گی۔ سید الشہداءؑ کے خنوصی نمائندے مسلم بن عقیلؑ کو فہ سے اطلاع دے چکے تھے کہ سب لوگ آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کے سوا امامت و خلافت کا مستحق کسی کو نہیں سمجھتے اور نہ آپ کے علاوہ کسی کی سربراہی انھیں منظور ہے اس لیے جتنی جلدی ہو سکے آپ آجاتے۔ اس طرح صورت حال بظاہر سازگار اور حالات موافق اور اطمینان بخش تھے۔ اس کے باوجود حسینؑ بن علیؑ موت، شہادت اور عراق کے بھیڑیوں کی بات کر رہے تھے۔ مطلب یہی ہے کہ آپ اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ بجز شہادت کے کوئی چیز نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

آج میں اپنی گزارشات اسی خطبے پر ختم کرتا ہوں۔ حُطَّ الْمَوْتُ عَلَىٰ وَٰلِدِ اَدَمَ مَحَطَّ الْقِلَادَةَ عَلَىٰ جِدِّ الْفِتَاةِ . میں اس وقت نہ اس جملے کی دلاویزی اور دلکشی کی بات کرنا چاہتا ہوں اور نہ لفظ حُطَّ میں جو حُشْنِ تعبیر ہے اس کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ مطلب اس فقرے کا یہ ہے کہ موت انسان کے گلے کا ہار ہے۔ وَمَا اَوْلَهْنِي اِلَى اسْلَافِيْ فِيْ اِيْنِ اسْلَافِ سِے ملاقات کا بہت مشتاق ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جب

تک میں وہ راستانہ اختیار کروں جس پر چل کر میں اپنے بابا علیؑ اور نانا خاتم الانبیاءؑ کے پاس پہنچ جاؤں، میرے اندازے میں موجودہ اجتماعی بگاڑ کا علاج ممکن نہیں۔ اَسْتِيَاقُ يَعْقُوبَ اِلَى يُوْسُفَ جِس طَرَحِ حَضْرَتِ يَعْقُوبَ اِپْنِي بِيْطِ يُوْسُفَ ؑ كِے عاشق و شفیقہ تھے، میں شہادت کا عاشق و شفیقہ ہوں۔ وَحَيِّرَ لِيْ مَصْرَعٌ اَنَا لَا قِيَّةَ . اللہ کی طرف سے میری قتل گاہ کا انتخاب ہو چکا ہے اور اب میں وہیں جا رہا ہوں۔

اس جملے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سارا منصوبہ خدائے تمیز کا ترتیب دیا ہوا تھا، حسینؑ بن علیؑ کا ساختہ پر داختہ نہیں تھا، خدا نے ازل ہی میں اس خطرناک اجتماعی بگاڑ کی اصلاح کے لیے حسینؑ کو شہادت اور جاننازی کے لیے چُن لیا تھا۔ وَحَيِّرَ لِيْ مَصْرَعٌ اَنَا لَا قِيَّةَ کا اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ خدا نے امام حسینؑ کے لیے شہادت مقدر کر رکھی تھی یا یہ کہ امام حسینؑ نے تقاضائے وقت کے مطابق خود شہادت کو گلے لگا لیا، مطلب دونوں لحاظ سے درست ہے۔

اس کے بعد آپ نے مطلب کو اور واضح الفاظ میں بیان کیا۔ فرمایا:

وَكَانِيْ بَاوَصَالِيْ تَتَقَطَّعُهَا عَسَلَانُ الْفَلَاوَاتِ
 بَيْنَ السَّوَابِيْسِ وَكَرِّيْلَاءَ . گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ عراق کے بیابان بھیرے تو اونس اور کر بلا کے درمیان میرے جسم کے ٹکڑے نوج رہے ہیں۔ فَيَمْلَأَنَّ مِنِّيْ اَكْرَاشًا
 جَوْفًا اور اپنے بھوکے پیٹ بھر رہے ہیں وَ اَجْرِبَةَ
 سُغْبًا . اور اپنی خالی زنبیلیں پُر کر رہے ہیں (ان کا کام پیٹ بھرنا ہے اور میرا کام اس شدید اجتماعی بگاڑ کا مقابلہ

کرنا پھر وہی بات ہے، وہی نقشہ ہے جو خداوندِ مُتَمَتَّل نے مسلمانوں کے اس خطرناک اجتماعی بگاڑ کا امام حسینؑ کی شہادت کی شکل میں تجویز کیا ہے) لَا مَجِيصَ عَنْ يَوْمٍ خُطِّ بِالْقَلَمِ جو قسمت کا لکھا ہے اس سے کوئی مفر نہیں۔ رَضِيَ اللهُ رِضَانًا أَهْلَ الْبَيْتِ نَصَبُ عَلِيٍّ بِلَادِهِ وَ يُوفِّيْنَا أَجُورَ الصَّابِرِينَ ہم اپنی بات کی خوشی وہی ہے جو اللہ کی رضا ہے۔ ہمارے بارے میں جو اسے پسند ہے ہم کو بھی وہی پسند ہے۔ اللہ کی طرف سے جو مصیبت پیش آئے ہم اس پر صبر کرتے ہیں اور اللہ ہمیں اس کا اچھا اجر دیتا ہے۔

میں چند جملے پھوڑ دیتا ہوں، آخر کا یہ جملہ بھی غیر معمولی توجہ کا مستحق ہے۔ فرمایا:

”مَنْ كَانَ فِينَا بَاذِلًا مُهَجَّتَهُ وَمَوْطِنًا عَلَيَّ لِقَاءَ اللَّهِ نَفْسُهُ فَلْيُرْحَلْ مَعَنَا فَإِنِّي رَاحِلٌ مُصْهِبًا إِنْ شَاءَ اللَّهُ. جو ہمارے لیے جان قربان کرنے اور خدا سے ملنے کے لیے تیار ہو وہ ہمارے ساتھ چلے ہیں
إِنشَاءَ اللہ کل ضیغ روانہ ہو رہا ہوں“

اس جگہ کا مطلب یہ ہے کہ دینِ خدا، انسانی حقوق اور اسلامی معاشرے کے دفاع سے متعلق مسائل ہر دور میں مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی وعظ و نصیحت کی اور کبھی اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں مضامین لکھنے کی تاکہ مسلمان ان

مضامین کو پڑھیں اور ضروریات دین سے باخبر ہوں۔ اس مجلے میں الشہداء نے واضح کر دیا کہ آج وہ موقع نہیں کہ مالی امداد، قلمی جہاد یا زبانی وعظ و نصیحت سے دین اسلام کی مدد کی جاسکے۔ وَمَنْ كَانَ فِينَا بَاذِلًا مُهْجَتَهُ اور کبھی اجتماعی بگاڑ اس درجے تک پہنچ جاتا ہے کہ سوائے شہادت، جان نثاری اور فداکاری کے اور کسی طرح فساد کو روکا نہیں جاسکتا اور بگاڑ کی بنیاد کو ڈھایا نہیں جاسکتا۔ مَنْ كَانَ فِينَا بَاذِلًا مُهْجَتَهُ کہہ کر آپ نے یہ واضح کر دیا کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ اب جبکہ امام حسینؑ راہ خدا میں قیام کر رہے ہیں، میں بھی پچاس روپے چندہ دے دوں گا یا عبید اللہ بن جریجؑ یہ کہیں کہ میں ایک مضبوط جنگی راہنما نذر کردوں گا یا کوئی یہ کہے کہ میں پانچ تلواریں، سات زرہیں اور چار نیزے پیش کردوں گا۔ امام حسینؑ کو نہ تلوار چاہیے نہ زرہ اور نہ نیزہ۔ بَلَّتِ اسلیمیہ کی کچی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ان باتوں سے حالات درست نہیں ہو سکتے، مجھے فقط جان چاہیے۔ جو جان دینے کو حاضر ہو، وہ کل میرے ساتھ چلے مَنْ كَانَ فِينَا بَاذِلًا مُهْجَتَهُ جو اپنا خون اس راہ میں دینے کے لیے تیار ہو وَمَوْطِنًا عَلٰی لِقَاءِ اللّٰهِ نَفْسَهُ خدائے مُتَعَالٰی سے ملنے کے لیے آمادہ ہو فَلْيَدْرِكْ مَعَنَا وہ ہمارے ساتھ چلے میں کل صبح روانہ ہو رہا ہوں۔

آج حرم کی آٹھویں شب ہے، شاید گفتگو آپ کی توقع سے زیادہ طول کھینچ گئی، پانچ منٹ اور اجازت دیجیے، کچھ مصائب اہل بیت کا ذکر ہو جائے:

فَلَمَّا رَأَاهُمُ الْحُسَيْنُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مُصِيراً

عَلَى قَتْلِهِ
یہ فقرہ مقتل ہشام بن محمد بن سائب کلبی سے منقول ہے۔ یہ
بزرگوار امام صادقؑ کے اصحاب میں سے تھے۔

جب امام حسینؑ نے روز عاشورا دیکھا کہ اہل کوفہ
ان کے قتل کا تہیہ کیے ہوئے ہیں آخِذِ الْمُصْحَفِ
وَنَشْرَهُ وَجَعَلَهُ عَلَى رَأْسِهِ تو آپ نے قرآن شریف
کھول کر اپنے سر پر رکھا اور یہ آواز بلند کہا: يَا قَوْمِ
بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ اللَّهِ وَجَدْتِي مُحَمَّدًا
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ، يَا قَوْمِ بِمَا
تَسْتَحِلُّونَ دَمِي؟ لوگو! میرے اور تمہارے درمیان

فیصلے کے لیے اللہ کی یہ کتاب موجود ہے۔ میرے نانا
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ لوگو! اگر تم کس جرم
میں میرا قتل جائز سمجھتے ہو؟ (قرآن میں آیہ تطہیر، آیہ
مباہلہ اور سورۃ بقرہ آئی دیکھو، سنت خاتم الانبیاء پر نظر
ڈالو، اس کے بعد اگر تم سمجھو کہ میرا قتل روا ہے تو قتل

کرو۔ اگر سمجھو کہ ناروا ہے تو اس فعل شنیع سے درگزر کرو)
ہائے افسوس کہ سید الشہداءؑ اہل کوفہ کے دینی جذبے کو اپیل
کر رہے تھے مگر وہ ایسے بت بنے کھڑے تھے جیسے دینی جذبے سے بے بہرہ
ہوں۔ تب آپ نے ان کے انسانی جذبے کو بیدار کرنا چاہا۔ اگر اہل کوفہ دین مذہب

۱۰ تذکرۃ النخاس، سبط ابن جوزی

سے لاتعلق ہیں، اگر انھیں خوفِ آخرت نہیں ہے تو آخر انسان تو ہیں انسان کے بھی جذبات ہوتے ہیں اور ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

فَاِذَا بَطِقِلْ لَهُ يَبْكِي عَاطِشًا وَيَكْهَانُ تَوَانُ كَا

ایک بچہ پیاس کی شدت سے بک رہا تھا۔

مجھے معلوم نہیں یہ بچہ کون تھا، لڑکی تھی یا لڑکا، شہر غرار تھا جسے کوئی کنیز یا غلام خیمہ سے باہر لایا تھا یا خورد سال تھا کہ خود اپنے پاؤں سے چل کر خیمہ سے نکل آیا تھا، یہ سب معلوم نہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ یہ خود ابو عبد اللہ امام حسینؑ کا ہی بچہ تھا۔ جب امام حسینؑ نے دیکھا کہ لڑکے کے دینی جذبات سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا تو انھوں نے دیکھا کہ ان کا ایک بچہ خیمہ سے باہر نکل آیا یا کوئی اس کو باہر لے آیا ہے، وہ پیاس کی شدت سے رو رہا ہے، تڑپ رہا ہے تو سید الشہداءؑ نے میرے الفاظ میں، انسانی جذبات کا سہارا لیا۔

فَاخَذَ عَلِيٌّ يَدَهُ وَقَالَ: يَا قَوْمِ اِنْ لَمْ تَرْحَمُوْنِي

فَارْحَمُوْا هَذَا الْوَلَدَ. لَسَ بَاتِحُوْنَ فِيْهِ اِطْحَاكُ كَمَا بَلَ

عَرَا قِيُوْا اِگْر تَمُّ كُوْجُهٗ پَر تَرَسْ نَهِيْسْ اَمَّا تُو اس مَعْصُوْمٌ نِچَّ

پیر ہی رحم کرو۔

لیکن انھوں نے عجیب جذبے کا اظہار کیا۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ جس طرح دینی جذبے سے خالی ہیں، اسی طرح انسانی جذبے سے بھی بے بہرہ ہیں، اس کا ثبوت وہ تیر تھا جو کمان سے نکل کر بچے کے حلقوم میں پیوست ہو گیا اور بچہ شہید ہو گیا۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ.

کامیاب جدوجہد

اَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
 بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ
 مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ. تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَ
 تُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ
 ذُنُوبَكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ. يَغْفِرَ لَكُمْ
 ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
 الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ. ذَلِكَ
 الْفَوْزُ الْعَظِيمُ. وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا. نَصْرٌ مِنَ
 اللّٰهِ وَقِتْحٌ قَرِيبٌ. وَيَشْرَ الْمُؤْمِنِينَ.
 ”لے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلاؤں جو

تم کو ایک دردناک عذاب سے بچالے۔ وہ یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ۔ یہی تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ ایسا کرو گے تو اللہ تمھارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو جنت کے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور ایسے عمدہ مکانوں میں داخل کرے گا جو ہمیشہ رہنے والے باغوں میں ہوں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ثمرہ بھی ہے جو تمھیں پسند ہے اور وہ یہ کہ اللہ کی طرف سے مدد اور جلد فتح یا پائی۔ اور اے پیغمبرؐ! مومنوں کو بشارت دیدیجئے“ (سورۃ صف - آیات ۱۳ تا ۱۴)

جب سے انسان پیدا ہوا ہے اس کی تقدیر میں مسلسل جدوجہد لکھ دی گئی ہے۔ خود اس کی سرشت میں متضاد عوامل کار فرما ہیں۔ وہ طرح طرح کی خواہشات اور بوقاموں تمتاؤں اور آرزوؤں کا مرکب ہے۔ اس کے بعض رجحانات ہوا و ہوس کے قبیل سے ہیں جن کو حیوانی خواہشات کہا جاسکتا ہے، جن کا مقصد کھانے پینے اور دیکھنے جیسی حیوانی لذتوں سے بہرہ مند ہونا ہے۔ اس میں کچھ اور ایسے رجحانات بھی ہیں جو اسے ان لذتوں سے ہٹا کر بلند تر روحانی، ذہنی اور انسانی لذتوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ انسان کی توانائیاں اور اس کا ارادہ ان متضاد اور مختلف النوع خواہشات کی آماجگاہ ہے۔ انسان ہمیشہ اپنی متضاد خواہشات کی وجہ سے الجھن کا شکار رہتا ہے۔

دیکھیے آدمی جب کوئی معمولی سا کام بھی کرنا چاہتا ہے تو اگر اسے

اس کام کی عادت ہے تو وہ اپنی عادت کی بنا پر بلا تامل اس کام کو انجام دے لیتا ہے۔ لیکن اگر کام نیا ہے اور اسے اس کام کی عادت نہیں تو وہ ایک دم اس کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور خیالات آتے ہیں۔ وہ کبھی سوچتا ہے یہ کام کروں اور کبھی سوچتا ہے کہ نہ کروں۔ کبھی کہتا ہے کہ یہ کام ٹھیک ہے اور کبھی خیال آتا ہے کہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہوس کہتی ہے کہ رو، عقل کہتی ہے مت کرو یا عقل کہتی ہے کہ رو، ہوس کہتی ہے مت کرو۔ ایک مدت تک اس کے دل اور دماغ میں اس طرح کشمکش رہتی ہے۔ بالآخر کوئی ایک رجحان غالب آجاتا ہے اور اس کے مطابق وہ اپنی توانائی اور ارادے کو کام میں لاتا ہے، ہوس اور عقل، مادیت اور روحانیت میں ازل سے جنگ جاری ہے اور زندگی کی بنیاد اسی کشمکش پر رکھی گئی ہے۔

اس اندرونی کشمکش کے علاوہ بیرونی دنیا میں بھی انسان کو اپنی خواہشات اور مقاصد کے حصول کی راہ میں آن گنت مشکلات اور رکاوٹوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چونکہ ہمیں ایسی مشکلات کی عادت ہو گئی ہے اور یہ ہمارے لیے کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے اس لیے روزمرہ زندگی میں ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو دن میں کئی بار آدمی کو کچھ رکاوٹیں پیش آتی ہیں، ان کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور ان کے خلاف جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

انسانی زندگی ہر ماحول میں ایک مسلسل کشمکش اور نزع سے عبارت ہے۔ فرد کی زندگی کو چھوڑیے، برادری اور معاشرے کی زندگی میں، اقوام، مملکت کی زندگی میں، ہر جگہ یہی جنگ اور مقابلے کا قانون جاری ہے۔

ایک پیشے کے افراد کا دوسرے پیشے کے افراد سے ، ایک برادری کا دوسری برادری سے ، ایک قوم کا دوسری قوم سے ، ایک معاشرے کا دوسرے معاشرے سے ، ایک طبقے کا دوسرے طبقے سے ہمیشہ مقابلہ جاری رہتا ہے جس کے نتیجے میں وقتاً فوقتاً قومی ، بین الاقوامی اور بین الطبقاتی جنگیں برپا ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ انسانی زندگی میں کشمکش اور مقابلہ ناگزیر حقیقت ہے۔

کہاں ہیں وہ لوگ ، جو یہ سمجھتے ہیں کہ جب سے وہ اس دنیا میں آنکھ کھولیں تب سے پچاس سال ، ستر سال ، سو سال تک بہتر سے بہتر زندگی گزاریں ، کھائیں ، پیئیں ، سوئیں اور ہر طرح کے عیش و آرام اور فانی البالی میں زندگی بسر کریں ، صبح کو نو دس بجے تک گھر میں آرام کریں پھر اگر دل چاہا تو کچھ کام کر لیا اور نہ چاہا تو نہ کیا۔ اگر کہیں کام پر گئے بھی تو دوپہر کو واپس آگئے ، قیل و نہ کیا اور رات کو پھر وقت پر سو گئے۔ گو ہمیں نظر نہ آئے لیکن ایسا شخص بھی ایک اندرونی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اسے وہ نشاط اور بشارت نصیب نہیں ہوتی جو زندگی میں جدوجہد کرنے والے کو حاصل ہے۔ وہ چلتا پھرتا کھانا پیتا ضرور ہے لیکن اس کی مثال اس مردہ کی سی ہے جو اُمنگ اور جوش سے محروم ہے ، اس کے باوجود بھی وہ ایک اندرونی کشمکش اور پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ ممکن ہے اس کشمکش کی اسے عادت ہو جانے کی وجہ سے اس کو احساس نہ ہو لیکن اس کے دل میں ہمیشہ رہ رہ کر یہ خیال تو ضرور آتا ہے کہ وہ بیکار کیوں بیٹھا ہے ؟ وہ دوسروں سے پیچھے کیوں رہ گیا ہے ؟ اس کو عزت و شہرت کیوں حاصل نہیں ؟ یہ

بے نتیجہ زندگی کس کام کی ہے ؟ اس میں جوش، لگن اور اُمتنگ کیوں نہیں ہے ؟ وہ اپنی تین آسانی اور بیکاری کے لمحات غالباً اسی جیص میں میں گزارتا رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کشمکش اور جدوجہد کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ زندگی فرد کی ہو یا کسی معاشرے کی، مُقابلہ، جدوجہد اور کشمکش کا قانون ہر جگہ جاری و ساری ہے چونکہ قانون یہی ہے، انسان کی سرنوشت یہی ہے کہ جدوجہد ناگزیر ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہم ایسی جدوجہد کا انتخاب کریں جو سود مند اور مفید ہو اور ایسا مقابلہ ہونا چاہیے جو شریفانہ، شہرت بخش اور بامقصد ہو۔ آج کی گفتگو کا موضوع یہی کامیاب جدوجہد ہے اور اس کا انتخاب ان تاریخی واقعات کی مناسبت سے کیا گیا ہے جو ان تاریخوں میں پیش آئے۔

کامیاب جدوجہد کی کچھ شرائط ہیں جن کا جاننا اور زندگی کی جدوجہد میں ان کا خیال رکھنا ضروری ہے :

✽ پہلی بات تو یہ ہے کہ جدوجہد کا کوئی متعین اور واضح مقصد ہونا چاہیے۔ بے مقصد جدوجہد کے کوئی معنی نہیں۔ ہر جدوجہد کا مقصد تو ضرور ہوتا ہے مگر عموماً مبہم ہوتا ہے، واضح نہیں ہوتا۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک شخص عمر بھر ہاتھ پاؤں مارتا ہے مگر آخر میں اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ کیوں ؟ اس لیے کہ اس کی کوشش اور جدوجہد کی کوئی ایک راہ معین نہیں تھی، اس نے کام کیا، کوشش کی لیکن اس کا مقصد واضح اور طے شدہ نہیں تھا، وہ اندھیرے میں ٹانگ ٹوتیاں مارتا رہا، اس کی محنت اکارت گئی اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اگر اقوام عالم کی

تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس طرح کی بیکار اور بے مقصد کوششوں کی بکثرت مثالیں ملیں گی۔ آپ لوگوں میں سے شاید ہر ایک نے اپنی یا اپنی قوم کی زندگی میں ایسی بے مقصد جدوجہد کی مثالیں اور نمونے دیکھے ہوں گے یا کتابوں میں پڑھے ہوں گے۔

جدوجہد کا واضح اور غیر مبہم ہدف اور مقصد ہونا ضروری ہے، ساتھ ہی یہ مقصد بلند پایہ اور باعنی ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ مقصد واضح اور معین ہے مگر اس کے حصول کے لیے آدمی وقت تو صرف کر سکتا ہے لیکن اگر مال خرچ کرنے کی بات آئے تو آمادہ نہیں ہوتا۔ کبھی وہ مقصد کو اس سے زیادہ اہم سمجھتا ہے اور مال خرچ کر کے مقصد حاصل ہو جائے تو وہ اس میں مضائقہ نہیں سمجھتا لیکن اگر صحت و تندرستی کو داؤ پر لگانا پڑے تو پھر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی اپنی صحت کی قربانی دینے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے لیکن جب جان خطرے میں نظر آتی ہے تو ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے ہیں، کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور آدمی پیچھے ہٹ جاتا ہے، لیکن کبھی مقصد اتنا بلند ہوتا ہے کہ آدمی اس کے لیے نہ صرف یہ کہ اپنی جان بلکہ اپنے عزیز ترین اقربا کو بھی پورے خلوص کے ساتھ قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہی وہ بیش قیمت مقصد ہے جس کی طرف ہر انسان کو توجہ کرنی چاہیے۔ یہ مقصد رضائے الہی کا حصول ہے۔ یہ ہونی کامیاب جدوجہد کی پہلی شرط۔

❖ دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی مستعد ہو، اسے کام کی لگن ہو

اور وہ اپنی بات پر قائم رہے۔

خود قرآن کریم میں ارشادِ ربّانی ہے :

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ
عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَ
أَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ. نَحْنُ
أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَ
لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهَى أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا
تَدْعُونَ.

یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار صرف
اللہ ہے اور اپنے اس اقرار پر قائم رہتے ہیں (موت
کے وقت اور قیامت کے دن) ان پر فرشتے اتریں گے
اور کہیں گے کہ ڈرو نہیں اور رنج نہ کرو۔ فرشتے ان کو
جنت کی بشارت دے کر کہیں گے کہ یہ ہے وہ جنت جس
کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم تمہارے دوست تھے
دنیا میں بھی اور دوست ہیں آخرت میں بھی۔ اس
جنت میں تمہارے لیے وہ سب کچھ ہے جس کو تمہارا
دل چاہے اور جو کچھ تم مانگو۔ (سورۃ النجم سجدہ۔ آیات ۳۰-۳۱)
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ.
كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ. إِنَّ
اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًا كَأَمْ
بُنْيَانَ مَرْصُوعًا.

اے ایمان والو! (یعنی اے وہ لوگو کہ جب رسول خداؐ
تیرہ سال تک مکہ میں توحید کی دعوت دیتے رہے تب

تو سوائے ایک چھوٹی سی تعداد کے تم نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ ہاں جب مدینہ آکر انھوں نے اسلامی حکومت تشکیل دی تو تم بھی اسلام کے فریفتہ اور شیفتہ بن گئے اور لگے اسلام کا دم بھرنے! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر تم عمل نہیں کرتے؟ اللہ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ تم ایسی بات کہو جس پر تمہارا عمل نہیں۔ اللہ تو ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح ایک جان ہو کر لڑتے ہیں جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔“

(سورہ صف - آیات ۲-۴)

مفسرین کہتے ہیں کہ جنگ بدر کے بعد جب کچھ مسلمانوں نے دیکھا کہ شہدائے بدر کی اللہ، رسول اور مسلمانوں میں بڑی عزت اور بڑا مرتبہ ہے اور ان کو دین اور دنیا دونوں کی نعمتیں مل گئی ہیں، دنیا میں بھی ان کی عزت ہے اور آخرت میں بھی ثواب ہے تو یہ مسلمان آپس میں بیٹھ کر کہنے لگے: يَا لَيْتَنَا كُنَّا مَعَكُمْ فَفَوْزَ فَوْزًا عَظِيمًا. کاش! ہم بھی جنگ بدر میں شرکت کر کے جہاد میں حصہ لیتے اور ہمیں بھی وہ عزت ملتی جو بدریوں کو حاصل ہوئی۔ یہ ایسی ہی بات تھی جیسا کہ آج کل کے شیعہ اکثر بلکہ بعض تو شاید ہر روز میدانِ کربلا کے شہیدوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں: يَا لَيْتَنَا كُنَّا مَعَكُمْ فَفَوْزَ فَوْزًا عَظِيمًا۔ اے کاش ہم آپ کے ساتھ ہوتے اور یہ عظیم سعادت ہمارے حصہ میں بھی آتی۔ یہ لوگ جہاں بھی بیٹھتے تھے، یہی ذکر اذکار رہتا تھا۔

اتفاق کی بات کہ کچھ عرصے کے بعد جنگِ احد کا واقعہ پیش آیا۔

لوگوں میں سے کچھ نے جن کی زبان پر ہر وقت یہ ذکر تھا کہ کاش جنگ بدر میں ہمیں شہادت کی سعادت حاصل ہوتی۔ شروع سے ہی پسپائی اختیار کی اور آخر یہ نوبت آگئی کہ خود رسول اللہ ص کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ یہی لوگ جو شہادت کی آرزو کرتے تھے، جب پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کو خطرہ لاحق ہوا تو اپنی جان بچانے کی فکر کرنے اور کوئی جائے پناہ ڈھونڈنے لگے۔

اس موقع پر خدا کہتا ہے: وہ بات کیا ہوئی جس کی تم تمنا کرتے تھے۔ تم تو کہتے تھے کاش جنگ بدر دوبارہ ہو اور ہم شہادت کی سعادت حاصل کریں۔ ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر تم عمل نہیں کرتے۔ اللہ ان لوگوں سے سخت ناراض ہوتا ہے جو فقط باتیں بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ہر طرح کی فداکاری اور جاں نثاری کے لیے تیار ہیں لیکن جب عمل کا موقع آتا ہے تو چھپتے اور جائے پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ خدا ایسے لوگوں سے ناراض ہوتا ہے کیونکہ یہ رہنماؤں کو دھوکا دیتے اور کامیاب جدوجہد کو بے اثر بنا دیتے ہیں۔ خدا ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے اور دشمن کے سامنے سیسہ بلائی ہوئی مضبوط دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ جدوجہد کو کامیاب بناتے ہیں۔

✪ ایک تیسری شرط جو بہت اہمیت رکھتی ہے اور ہم لوگوں میں کم دیکھنے میں آتی ہے، وہ ہے جدوجہد کے صحیح طریقے کا انتخاب۔ جدوجہد کی مختلف اور متعدد قسمیں ہیں مثلاً: انفرادی جدوجہد۔ اجتماعی جدوجہد۔ خفیہ جدوجہد۔ علانیہ جدوجہد۔ نرم جدوجہد۔ سخت جدوجہد۔ مسلح جدوجہد۔ غیر مسلح جدوجہد۔ سرد ہتھیاروں سے جدوجہد۔

گرم ہتھیاروں سے جدوجہد۔ میدان جنگ سے دور مقامی جدوجہد۔
میدان جنگ میں جدوجہد۔ وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا موقع، اپنا
وقت اور اپنا طریقہ ہے۔ یورپ کی اصطلاح میں ہر جدوجہد کے اپنے اپنے
ٹکٹکس ہیں۔

جو لوگ کسی مقصد کے لیے جدوجہد کا بیڑا اٹھاتے ہیں انہیں اس
کا صحیح طریقہ بھی معلوم ہونا چاہیے۔ مقصد اور جدوجہد کے طریقے اور نوعیت
میں مناسبت بے حد اہم ہے۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ ہم دیکھتے ہیں
کہ لوگ بڑے خلوص، دلچسپی اور نیک نیتی سے کسی مقصد کے لیے روپیہ
خرچ کرتے ہیں، وقت صرف کرتے ہیں اور بعض اوقات جان کی قربانی بھی
دیتے ہیں لیکن غلط طریقے سے۔ وہ اپنے خیال میں یہ سب کچھ نیک مقصد
کے لیے کرتے ہیں لیکن ان کا طریقہ درست نہیں ہوتا۔ ان کے مقصد اور
طریقے میں کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ لے اعرابی
ایں رہ کہ تومی روی بترکستان است

میں پھر کہتا ہوں کہ مقصد اور اس کے حصول کے لیے جو طریقہ
اختیار کیا جائے، ان دونوں میں مناسبت کا ہونا بے حد ضروری اور بہت
اہم ہے۔ اکثر جدوجہد اس لیے ناکام رہیں کہ ان کے لیے صحیح طریقہ اختیار
نہیں کیا گیا۔

اب اگر آپ حضرات یہ تین شرائط ذہن میں رکھیں تو یہ سمجھنا
مشکل نہیں کہ کربلا کے حادثہ فاجعہ نے کیا رُخ اختیار کیا تھا۔ معاویہ کے
بعد یزید جس کا نسب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی، بادشاہ اسلام اور

جانشین رسولؐ کی حیثیت سے مسلمانوں پر حکومت کرتا تھا۔ مگر وہ علانیہ
 شراب پیتا تھا، جو اکھیلتا تھا، غیر طبقاتی اسلامی معاشرے میں اس نے
 طبقاتی اور خاندانی امتیاز پیدا کر دیا تھا۔ یہ تھا نتیجہ اس کی حکومت کا۔
 ایسے شرابی، بے عقل اور بے سمجھ شخص کے خلیفہ ہونے پر چیتہ
 جانباڑوں نے اس کی بد عنوان حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کم از کم
 وہ اس کے ساتھ تعاون پر آمادہ نہیں تھے۔ مگر مزید کہاں چھوڑتا تھا۔ اس
 نے اپنے تمام اعمال، سرداروں اور گوزروں کو حکم دیا کہ سب لوگوں خصوصاً
 سربراہان اور لوگوں سے اس کے لیے بیعت یعنی تعاون کا عہد لیا جائے۔ لیکن
 مدینہ جو اسلام کا گہوارہ تھا وہاں کے چند ممتاز اور مشہور لوگ یزید کی
 حکومت کو باضابطہ طور پر تسلیم کرنے اور اس کے کارندوں کے ہاتھ پر
 بیعت کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان ہی میں سے ایک امام حسینؑ تھے۔
 اسی دوران کوفہ میں بھی کچھ لوگ جمع ہوئے۔ مناسب ہو گا کہ
 میں کوفہ کا قدرے تعارف کرادوں۔ کوفہ خراب شہر بھی تھا اور اچھا شہر بھی
 تھا۔ خراب تو اس لیے تھا کہ وہاں بڑی تعداد میں ایسے لوگ رہتے تھے
 جو ڈرپوک تھے، فیصلہ کرنے میں ہچکچاتے تھے اور اس لیے ناقابل اعتماد
 تھے۔ اچھا اس لیے تھا کہ وہاں وہ درختاں ستارے بھی تھے جنہوں نے
 امیرالمومنین امام علیؑ کی سرپرستی میں تربیت پائی تھی۔ گو ایسے لوگوں کی
 تعداد بہت کم تھی لیکن انہوں نے اپنے دل میں غور کیا کہ کیا یزید کی
 بیعت مناسب ہے؟ پھر عوام سے مشورہ کیا۔ سب نے نفی میں جواب
 دیا اور کہا کہ یزید ہرگز اس منصب کے لائق نہیں۔
 اب سوال پیدا ہوا کہ پھر کس کی طرف رجوع کیا جائے؟

ادھر ادھر ٹوہ لینے پر سنا کہ حجاز میں دو تین بلکہ اس سے بھی زیادہ ممتاز لوگوں نے یزید کی بیعت سے انکار کیا ہے۔ ان میں سب سے قدر اور شخصیت ابو عبد اللہ امام حسینؑ کی تھی۔ چنانچہ ان سے خط و کتابت شروع کی، ان کو دعوت دی اور لکھا گیا کہ

”آپ اپنے والد کے پایہ تخت میں تشریف لائیے یہاں خواہش ہے کہ ہم آپ کی ہمراہی میں اس حکومت سے جنگ کریں، مقابلے کے لیے زمین ہموار ہے“

امام حسینؑ کے پاس ایک خط پہنچا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا یہاں تک کہ خطوط لانے والے ایچھوں کا تانتا بندھ گیا۔ دس خط، بیس خط سو خط۔ کسی پر ایک شخص کے دستخط تھے، کسی پر دو کے، کسی پر پانچ، دس کے۔ حضرت کے پاس مختلف جگہوں سے خطوط کا ڈھیر لگ گیا۔ غرض جیسا کہ آپ کو تفصیل سے معلوم ہے، مسلم بن عقیلؑ حضرت کی طرف سے کوفہ آئے تاکہ صحیح صورت حال معلوم کر کے امام کے لیے لوگوں سے بیعت اور عہد و پیمان لیں اور امام کو اس کی اطلاع دیں تاکہ امام یہ طے کر سکیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ یہ تھی امام کے قیام اور مقابلے کی ابتدا۔

لیکن ابو عبد اللہ کا مقصد کیا تھا؟ کیا ان کا مقصد حکومت پر قبضہ کرنا تھا؟ کیا ابو عبد اللہ یہ چاہتے تھے کہ بلاد اسلامی خصوصاً عراق اور کوفہ پر حکومت کریں؟

نہیں ان کا مقصد حکومت حاصل کرنا نہیں تھا۔ ان کی غرض اعلائے کلمہ حق تھی، حق اور باطل میں تمیز تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ خواہ حکومت ملے یا نہ ملے لوگوں پر یہ بخوبی روشن ہو جائے کہ حق کیا ہے اور

باطل کیا۔ اگر حکومت مل سکے تو فیہا، ایسی صورت میں حکومت کی طاقت سے وہ کام لیں جو خدا کو پسند ہے لیکن اگر حکومت ہاتھ نہ آسکے جب بھی ان کا مقصد کہیں نہیں گیا۔

میدانِ کربلا میں جو واقعات پیش آئے تاریخ نے ان کو ہمیشہ کے لیے سنہری حروف میں لکھ لیا ہے۔ کربلا میں مسلمانوں کا جہادِ ابد تک کے لیے حق و باطل کے درمیان جنگ کا عالی ترین نمونہ قرار پا گیا ہے۔ سبحان اللہ! کتنا بلند اور ارفع مقصد تھا اور ساتھ ہی واضح، روشن اور فیصلہ کن۔ آپ نے جنگ کے لیے کتنے لوگوں کا انتخاب کیا۔ ان مردانِ ثابت قدم کا جو اجتماعی جدوجہد میں پیش قدمی کے خواہاں تھے، جو ابو عبد اللہ سے سبق لینا چاہتے تھے۔

اس جدوجہد میں دو طرح کے لوگ شریک تھے؛ ایک تو وہ جو جنگ میں ریڑھ کی ہڈی کا کردار انجام دے رہے تھے۔ ضرورت تھی کہ یہ لوگ آزمودہ کار اور قابلِ اعتماد ہوں، ان کے بازو قوی اور ہمتیں بلند ہوں، وہ ثابت قدم ہوں، اپنا فرض پہچانتے ہوں، فرماں بردار اور وفا شعار ہوں، ان کا نمونہ مسلم بن عقیل ہیں۔ ایک دوسرا نمونہ قیس بن مسہر صیداوی ہیں، جنھوں نے امام کا خطِ کوفہ میں پہنچایا تھا۔

ابو عبد اللہ نے ان لوگوں کا انتخاب کمالِ احتیاط سے کیا تھا۔ ایک اور گروہ تحریک کے حامیوں کا تھا۔ ضرورت کے وقت ان سے مدد لی جاسکتی تھی لیکن ان کے انتخاب میں اس قدر کدو کاوش کی گنجائش نہیں تھی؛ ان کا کام صرف متابعت تھا، ان میں سے بھی کچھ حسین بنی قافلے کے ساتھ ہو گئے تھے۔

جب مسلم مدینہ سے چل کر کوفہ پہنچے تو وہاں کچھ نئے واقعات پیش آئے۔ ایک جرمِ غفیر مسلم کے گرد جمع ہو گیا۔ کوفہ کا والی نعمان بن بشیر معزول کر دیا گیا، اس کے بجائے ابن زیاد کو مقرر کیا گیا۔ ابن زیاد خونخوار اور بہت سخت گیر تھا۔ اب چوبیس گھنٹے کے اندر حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ آٹھویں ذی الحجہ کو عصر کے وقت مسلم کو خبر ملی کہ کمزور طبیعت لوگوں کی بدولت ان کے میزبان ہانی بن عروہ کو دھوکے سے دارالامارہ پہنچا دیا گیا ہے۔ ابن زیاد نے وہاں ہانی کی سخت توہین کی، لکڑی سے ان کے سر اور چہرے پر ضربیں لگانے کے بعد ان کو قید کر دیا۔ ہانی کے قید ہو جانے پر مسلم نے خاص آدمیوں سے کہا کہ وہ تحریک کے حامیوں کو مطلع کر دیں کہ وہ کوفہ کی مسجد اور اس کے اطراف میں جمع ہو جائیں تاکہ وہ ان سے وہاں خطاب کر سکیں۔ دارالامارہ مسجد کے سامنے ہی ہے۔ ابن زیاد کسی دن سے کوفہ کا حاکم اور مصروف کار تھا لیکن اس کے پاس تیس سے زیادہ پولیس والے نہیں تھے، ان کے علاوہ بنی امیہ کے حامی بیس آدمی اور تھے جو اس کے ساتھ تھے۔ ابن زیاد اور اس کے ان تقریباً پچاس ساتھیوں نے بالاخانے پر چڑھ کر نظر دوڑائی کہ دیکھیں مسجد میں کیا ہورہا ہے۔ جیسے ہی ان لوگوں نے ابن زیاد اور اس کے حامیوں کو دیکھا، ان کے خلاف نعرے لگانے شروع کر دیے اور ابن زیاد اور اس کے ساتھیوں پر پتھراؤ کرنے لگے، ابن زیاد اور یزید کی حکومت کو ملامت کرنے لگے۔

یہ تھی صورت کوفہ میں ابن زیاد اور حضرت مسلم کی۔
 آٹھویں ذی الحجہ کی شام کو ابن زیاد نے اس صورت حال کا بغور

مطالعہ کیا۔ آخر اس نے کچھ ایسی چالیں چلیں جن کی تفصیل عرض کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اس نے کچھ لوگوں کو بھیجا جو ایک ایک، دو دو اور چار چار کر کے لوگوں کو مسجد سے باہر لے گئے۔ ماں آئی اپنے بچے کو لے گئی۔ باب آیا اپنے بیٹے کو لے گیا۔ ساس آئی داماد کو لے گئی۔ چچا آیا بھتیجے کو لے گیا۔ کوئی کسی کو لالچ دے کر لے گیا اور کوئی دھمکی دے کر۔ مغرب کی نماز کا وقت ہوا تو مسلم نے چاہا کہ مغرب کی نماز پڑھیں۔ فقط تیس آدمی باقی تھے جنہوں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز ختم ہوئی تو مسلم نے مسجد سے باہر جانا چاہا۔ دیکھا تو وہاں نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔ انھیں اپنی منزل کا بھی صحیح راستا معلوم نہیں تھا۔ کوفہ کے گلی کوچوں سے نا آشنا تھے۔ اجنبی، بے یار و مددگار۔ کوئی نہیں رہا تھا جو راستا ہی بتلاتا۔ یہ تھے کوفہ کے ناقابل اعتبار اور بے وقعت لوگ۔ یہ لوگ ہرگز اس قابل نہیں تھے کہ ان کے بھروسے پر کوئی جدوجہد کی جاسکتی۔

یہ نمونہ ہے ان ناقابل اعتبار لوگوں کا جن کے متعلق مسلم نے امام کو لکھا تھا اور مسلم کے کہنے پر امام مکہ سے روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں بہت سے لوگ حسینی قافلے میں شامل ہوتے رہے، لوگ آتے رہے یہاں تک کہ عراق کے نزدیک پہنچ کر امام کو اطلاع ملی کہ حالات وہ نہیں رہے جن کی مسلم نے اطلاع دی تھی۔ حالت بالکل بدل چکی ہے۔ مسلم اور ہانی قتل ہو چکے تھے۔ عبداللہ بن یقظہ جو مسلم اور اہل کوفہ کے نام امام کا خط لے کر گئے تھے وہ راستے ہی میں گرفتار ہو کر قتل ہو چکے تھے۔

شیخ مفید ارشاد میں لکھتے ہیں کہ
 ”مسلم آٹھویں ذی الحجہ کو منگل کے دن کوفہ پہنچے تھے

اور نویں ذی الحجہ کو بدھ کے دن شہید ہوتے۔“

(ارشاد مطبوعہ اصفہان صفحہ ۱۹۸)

بہر حال ان وحشت ناک خبروں کی وجہ سے حسینیؑ کی تحریک رک

نہیں گئی البتہ اس کا طریقہ کار اور حکمت عملی ضرور بدل گئی۔

اب چونکہ حالات بدل چکے تھے، حضرت نے اپنے سب ہمراہیوں

کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا اور اس کے بعد وہاں آکر ایک تحریر

پڑھی۔ خدائے عروج کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا :

”کوہ سے جو اندوہناک خبریں آرہی ہیں وہ تم نے

سن لی ہوں گی۔ مسلم، ہانی اور عبداللہ بن یقظہ قتل ہو چکے

ہیں، لوگوں نے ہمارے ساتھ دعا کی ہے، میں اپنا سفر جاری

رکھنا چاہتا ہوں تاکہ میں بھی قتل ہو جاؤں۔ تم میں سے

جو شخص مال و منال، مقام و منصب اور خوشحال زندگی کی

امید میں میرے ساتھ آیا ہے وہ چلا جائے۔“

چنانچہ جو لوگ راستے میں سے قافلے کے ساتھ ہو گئے تھے ان میں

سے بیشتر چلے گئے۔ صرف امام حسینؑ بن علیؑ رہ گئے اور وہ لوگ جو مدینہ سے

ان کے ساتھ آئے تھے۔ ان کے علاوہ صرف چند افراد جو راستے سے ساتھ

ہوئے تھے ثابت قدم رہے۔ قدرتی طور پر دوسروں کے حوصلے جواب دے

گئے چونکہ اب جدوجہد کا نقشہ بدل چکا تھا، اس لیے صرف پاک

طینت اور راسخ العقیدہ افراد ہی ساتھ دے سکے۔

کر بلا میں ضرورت بھی ایسے ہی لوگوں کی تھی جو باہمت اور بلند حوصلہ

ہوں مقصد پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں اور جان کی قربانی دینے کے لیے

تیار ہوں۔

جنگ اور مقابلے کی صورت میں ایک چیز کی بڑی اہمیت ہے جو افراد رابطے کے لیے استعمال کیے جاتیں وہ صحیح اور قابل اعتماد ہوں اور رابطے کا پورا نظام تجربہ کار، ایماندار اور مقصد سے وفادار افراد پر مشتمل ہو۔ رابطے کے لیے ایک ایسی قابل قدر شخصیت کی مثال قیس بن مسہر صیداوی تھے جو امام حسینؑ کا اہل کوفہ کے نام خط لے کر کوفہ کی طرف آرہے تھے۔ قادیسیہ کے نزدیک ابن زیاد کے ایک افسر حصین بن نمیر نے ان کو گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ ابن زیاد نے ان سے کہا کہ اگر جان کی امان چاہتے ہو تو منبر پر جا کر امام حسینؑ کو گالیاں دو۔ قیس نے منبر پر کھڑے ہو کر کہا:

”سب تعریف اللہ ہی کو زیاد ہے۔ حسین بن علیؑ خلاق میں بہترین ہیں۔ آپ دُخترِ رسولِ خداؐ کاظمہؑ کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ انھوں نے مجھے پیغام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ یہ پیغام میں آپ سب لوگوں تک پہنچا دوں آپ سب لوگ فوراً ان کی امداد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔“

اس کے بعد قیس نے امام علیؑ اور امام حسینؑ پر درود بھیجا اور معاویہ، یزید اور عبید اللہ بن زیاد پر نفرین کی۔ انھوں نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ عبید اللہ بن زیاد نے کہا کہ اس کو منبر پر سے اتار دو۔ چنانچہ انھیں منبر سے اتار کر محل کی چھت سے نیچے پھینک دیا گیا اور وہ شہید ہو گئے۔

غرض امام حسینؑ اپنی مختصر سی جماعت کے ساتھ کوفہ کی طرف گامزن

ہے۔ راستے میں حُر سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے اپنا راستا بدل دیا اور ایک ایسے راستے پر چل پڑے جو نہ کوفہ جاتا تھا اور نہ مدینہ تاک سوچ سکیں کہ اب انھیں کیا کرنا ہے۔

واقعات پر غور کیجیے۔ پہلے تو امام مدینہ سے مکہ گئے اور پھر کربلا کا رُخ کیا۔ مقصد صاف اور واضح ہے۔ دین حق، حقیقت اور قانونِ الہی کا دفاع اور رضائے الہی کا حصول۔ طریقہ اور روش بھی متعین ہے۔ امام حسینؑ جانتے تھے کہ اس راستے پر چلنا چاہیے کہ جہاں سے پھر واپسی کا سوال ہی نہ ہو۔ اگر امامؑ نے راستے میں اور عاشورا کے دن بھی ابن زیاد کے عہدیداروں سے یہ کہا کہ اگر اہل کوفہ نہیں چاہتے کہ میں ان کے شہر جاؤں تو مجھے پھوڑ دو، میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں گا تو اس معاملے کے کچھ اور پہلو تھے۔ ورنہ اُنہائے راہ میں امام نے مکرر یہ فرمایا تھا کہ جس راستے پر ہم چل رہے ہیں اس میں واپسی نہیں ہے۔

امامؑ قصر بنی مقاتل کی منزل سے روانہ ہوئے تھے، ابھی حُر نے ابن زیاد کو جو خط لکھا تھا اس کا جواب نہیں آیا تھا اس لیے یہ بات صاف نہیں ہوئی تھی کہ آخری فیصلہ کیا ہوگا۔ عقبہ بن سمان کہتے ہیں کہ میں امام کے قریب ہی تھا، میں نے دیکھا کہ امام اپنی سواری ہی پر اونگھنے لگے۔ ذرا ہی آنکھ لگی تھی کہ پھر بیدار ہو گئے۔ فرمایا: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ آپ نے تین بار یہی فرمایا۔

آپ کے فرزند دلبند علی اکبرؑ نے آگے بڑھ کر عرض کیا: بابا جان! کیا بات ہے آپ کلمہ استرجاع پڑھ رہے ہیں؟

فرمایا: بیٹے! سواری پر سو گیا تھا، میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے قافلے کے لوگ جا رہے ہیں اور موت ان کا پیچھا کر رہی ہے۔
 آپ جانتے ہیں کہ علی اکبرؑ نے کیا کہا ہوگا۔ انھوں نے عرض کیا:
 کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟
 امامؑ نے فرمایا: کیوں نہیں۔

انھوں نے کہا کہ پھر موت کا کیا ڈر؟ ہم آخری سانس تک راہِ حق سے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ ہم موت کو خوش آمدید کہتے ہیں۔
 اسی طرح کے افراد کی امام حسینؑ کو ضرورت تھی۔ نینوا اور کربلا پہنچنے سے پہلے امام نے ایک مرتبہ پھر کہا تھا کہ ہم موت کے استقبال کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ ضروری بھی تھا کہ لوگوں کے ذہن نشین کر دیا جائے کہ وہ کوفہ کی حکومت حاصل کرنے نہیں آتے تاکہ کل کھلاں کو لوگ یہ نہ کہیں کہ آتے تو تھے اہل کوفہ کے بلانے پر، بعد میں جب دیکھا کہ کوفہ پر قبضہ کرنا ممکن نہیں تو غیرت کو جوش آیا اور فیصلہ کر لیا کہ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے، حکومت سے محرومی کی تلخی کو برداشت نہ کر سکے۔ اسی لیے آپ نے بار بار کہا کہ ”اگر تمہیں میرا آنا پسند نہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں، یہ خیال نہ کرو کہ میری غیرت جوش میں آگئی ہے حکومت سے محرومی کے بعد اب مجھ میں زندہ رہنے کی تاب نہیں، اب میں خودکشی پر آمادہ ہو گیا ہوں۔“ یہ جملہ بار بار اس لیے دہرایا تاکہ کوئی ان کے متعلق
 وَلَا تَلْقُوا يَا دِيْدِيكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ والی آیت نہ پڑھ لے۔ واقعہ کربلا کی صحیح تفسیر اور توجیہ کے لیے اس جملے کا تاریخ میں رہنا اور بار بار دہرایا جانا ضروری ہے۔ اس سے وہ تمام چھوٹے چھوٹے واقعات جو روزِ عاشورا

تک اس تمام مدت میں پیش آئے بخوبی سمجھ میں آجاتے ہیں۔
 آپ حضرات اس نکتے کو خوب غور سے سمجھ لیجیے کہ امام کیا چاہتے
 تھے۔ واقعہ کہ بلا میں دشمن کی تحریف اور رنگ آمیزی کے باوجود اس واقعہ
 کی جو تفصیل انکی نسلوں تک پہنچی ہے اس میں بھی ایک سبق موجود ہے
 عاشوراء کے دن جب معلوم ہو گیا کہ جنگ ناگزیر ہے تو امام حسینؑ
 نے صف بندی کرنے کے بعد حکم دیا کہ سب خیمے ایک جگہ لا کر جمع کر دیے
 جائیں۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ خیموں کی پشت پر جو خندق کھودی گئی
 تھی اس میں کافی مقدار میں لکڑیاں ڈال کر ان میں آگ لگا دی جائے
 تاکہ دشمن پیچھے کی طرف سے حملہ نہ کر سکے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی بہتر
 نفری فوج کو ترتیب دیا اور اس زمانے کے جنگی طریقے کے مطابق میمنہ،
 میسرہ اور قلب لشکر قائم کیے، پرچم بردار اور علمدار مقرر کیے۔ ابھی حضرت
 اپنے لشکر کو ترتیب دے ہی بسے تھے کہ دشمن کے کچھ پیادہ اور سوار سپاہیوں
 نے باہم مشورہ کیا کہ چلو حسینؑ خیمہ گاہ پر پیچھے سے حملہ کر دیں۔ ان میں سے
 ایک بلکہ ان سب کا گرو گھنٹال شمر تھا۔ یہ لوگ منصوبے کے مطابق حملہ
 کرنے کے لیے آتے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں تو خندق کھدی ہوئی
 ہے اور اس میں آگ روشن ہے، گویا زبردست جنگ کی تیاری ہے۔ یہ
 لوگ امام حسینؑ کی اس کارروائی سے بڑے دل شکستہ ہوئے۔ شمر نے چلا کر
 کہا:

”حسینؑ! روز قیامت کا بھی انتظار نہ کیا، دنیا ہی میں
 اپنے ہاتھ سے اپنے لیے آگ تیار کر لی“
 شمر کا یہ جملہ حسینؑ کے طرفداروں اور خیر خواہوں کے دلوں میں زہر

میں مجھے ہوتے تیر کی طرح لگا اور ان کے جگر چھلنی کر گیا۔ مُسَلِم بن عَوْسَجَہ نے عرض کیا:

”مولا! مجھے اجازت دیجیے کہ اس خلیفہ کو ہمیں سے ایک تیر مار کر جہنم رسید کر دوں۔“

غور کیجیے امام نے کیا فرمایا۔ آپ نے فرمایا:

”نہیں! میں اس کے لیے تیار نہیں کہ جنگ ہماری طرف سے شروع ہو، میں چاہتا ہوں کہ دُنیا دیکھے کہ میں اس پیغمبر کی پیروی کر رہا ہوں جس نے تمام جنگیں اسلام کے دفاع میں لڑیں۔ کسی کو یہ جُرأت نہیں ہونی چاہیے کہ یہ کہے کہ پیغمبر اور خاندان پیغمبرؑ نے اپنی بات بزورِ شمشیر اُوچھی رکھنے کی کوشش کی۔ میں چاہتا ہوں کہ دُنیا دیکھے کہ میں نے لڑائی شروع نہیں کی۔“

آپ نے مُسَلِم بن عَوْسَجَہ سے فرمایا: ”تم تیر مت چلاؤ، لڑائی ان کو شروع کرنے دو۔“ اس کے بعد آپ نے دوبارہ صف بندی کی۔ پھر فرمایا: پہلے مجھے ان لوگوں سے بات کرنے دو۔ پھر اپنے راہوار پر سوار ہو کر بڑی شان سے دشمن کے لشکر کی طرف بڑھے اور دشمن کے سامنے کھڑے ہو کر بہ آواز بلند سب کو خاموش رہنے اور اپنی بات سننے کے لیے کہا۔ جب سب لوگ چُپ ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہو گئے تو آپ نے تقریر شروع کی۔ امام کی تقریر میں دو تین جملے بڑے توجہ طلب تھے۔ ایک تو آپ نے یہ فرمایا کہ

”لوگو! اگر تم مجھے نہیں پہچانتے تو جاؤ اور ان لوگوں سے

پوچھو جو تم میں سے خاندانِ پیغمبر سے واقف ہیں، وہ تم سے میرا تعارف کرا دیں گے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں رسولِ خدا کا فرزند ہوں۔“

اب سوچیے کہ امام حسینؑ میدانِ کربلا میں عاشورا کے دن کیوں اپنا تعارف کرا رہے ہیں؟

اس لیے کہ کل کو کوئی منافق دغا باز مکر و فریب سے یہ نہ کہہ سکے کہ ابن زیاد نے ہمیں بے وقوف بنایا، دھوکا دیا۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ یہ کوئی اور شخص ہے جو آیا ہے، اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ یہ فرزندِ رسولؐ ہے تو ہم ہرگز اس سے جنگ نہ کرتے بلکہ اس کی مدد کرتے۔

حضرات! میں نے جو یہ نکتہ بیان کیا ہے اس پر ذرا بھی تعجب نہ کیجیے، آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ لوگ کس طرح حقائق کو توڑ مڑ کر دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اُس زمانے میں تو رسل و رسائل کے ذرائع بہت ہی کم تھے، لوگوں کو حقائق کا علم بہت کم تھا، ابلاغ کے تمام وسائل حکومت کے ہاتھ میں تھے اس لیے ان دنوں حقائق کو منسوخ کرنا بہت آسان کام تھا۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟ دیکھو شام میں معاویہ نے امام علیؑ کو کس کس طرح بدنام کیا۔ ایسے میں اس پر تعجب کیوں ہو کہ امام حسینؑ کو یہ فکر لاحق تھی کہ مہاراجا کل کو یہی لوگ کہنے لگیں کہ اگر ہم جانتے کہ یہ مسافر جسے دعوت دے کر بلایا گیا ہے حسینؑ بن علیؑ ہیں تو ہم ان کے دفاع میں جان لڑا دیتے۔ یہ وجہ تھی کہ امام حسینؑ نے اپنا تعارف خود کرایا۔

پھر آپ نے فرمایا:

”لوگو! تم یہاں مجھ سے مقابلہ کرنے آئے ہو، کیا تم نے

ہی مجھے نہیں بلایا تھا؟ وہ تمہارا بلاوا کیا ہوا؟ اور اب
 میرے مقابلے کے لیے تمہارے آنے کا کیا مطلب ہے؟
 کیا اس دوران میں مجھ سے کوئی ایسی خطا ہو گئی، کوئی
 ایسا گناہ سرزد ہو گیا ہے کہ میرا خون حلال ہو گیا اور مجھے
 مار ڈالنا روا ہو گیا؟ کیا میں نے تم میں سے کسی کو قتل کیا
 ہے؟ آخر تم کس بنیاد پر میرے قتل کے درپے اور میرے
 خون کے پیاسے ہو گئے؟

یہ آپ نے اس لیے فرمایا تاکہ آئندہ کوئی تو تا چہشم کو فیوں کے
 فعل کی یہ توجیہ نہ کرنے لگے کہ جو کوئی حکومت وقت کے خلاف اٹھے وہ
 باغی ہے اور اس کا خون مباح ہے۔

جہاں تک امام عالی مقام کے قتل کا تعلق ہے خود ان ہی لوگوں
 نے تو امام کو بلایا تھا۔ آپ یہ سمجھنا چاہتے تھے کہ خود تم نے ہی مجھے دعوت
 دی تھی، میں نے تمہاری ہی دعوت قبول کی ہے۔ تم نے ہی کہا تھا کہ
 خدا کا دین پائمال ہو رہا ہے، میں دین اسلام کے دفاع کے لیے یہاں
 آیا ہوں، اب تم کس منہ سے کہو گے کہ ہم نے حسینؑ کو پہلے تو بلایا، ان
 کے ساتھی اور حامی بنے اور پھر کربلا میں شہید کر دیا۔ کیا تاریخ میں سرخروئی
 کی یہی باتیں ہیں۔ یہ ہیں واقعہ کربلا سے متعلق کچھ سبق آموز اور توبہ طلب نکات
 مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا وہ تو میں کر چکا۔ اب آؤ کہ آج کی رات شہید
 کربلا کا ماتم کریں اور توجہ خوانی کریں۔ کوئی صاحب یہ کام انجام دیں۔

اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا اس کا ما حاصل یہ ہے کہ سب مسلمان
 سب ہونا خواہاں و شیفگان حسینؑ اور سب بیروان توحید یہ سمجھ لیں کہ زندگی

میں کشمکش ناگزیر ہے، جدوجہد ہمیشہ جاری رہنی چاہیے۔ لذیذ ترین اور شیرین جدوجہد وہ ہے جو حق کی حمایت میں اور باطل کے خلاف ہو حق کی سوچ کا زندہ رکھنا اور قانون حق کو نافذ کرنے کے لیے کوشش کرنا ضروری ہے۔

یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ جدوجہد ایک درخشاں اسلامی روایت ہے اور اگر اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل کرنا مقصود ہے تو پھر ہدف ایسا ہونا چاہیے جو شک و شبہ سے بالاتر ہونے کے ساتھ ساتھ صاف، روشن، واضح اور قابل اعتماد ہو۔ یہ ہدف جب لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ اس کو مان لیں اور دل و جان سے اس کے لیے کوشش کریں اور بوقتِ ضرورت جان و مال نثار کرنے سے بھی دریغ نہ کریں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ زمانہ کے حالات کے مطابق حکمتِ عملی وضع کی جائے اور زمان و مکان کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر لائن آف ایکشن اختیار کی جائے۔

اگر ان سب باتوں کا دھیان رکھا جائے تو کامیابی یقینی ہے، اللہ کی مدد ضرور شامل حال ہوگی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ
وَيُخْرِجْ أَقْدَامَكُمْ.

”اے ایمان والو! اگر تم جدوجہد کرو گے تو خدا ضرور تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔“

(سورۃ محمدؑ - آیت ۷)

اگر او خدا میں جان و مال کی قربانی دو تو سمجھ لو :

● اول تو دین و دنیا کی بھلائی اور کامیابی حاصل ہوگی ،
 ● دوسرے جنت الفردوس کے مستحق بنو گے اور
 ● تیسرے :

وَ أُخْرَى تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَ فَتْحٌ
 قَرِيبٌ، وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ .

ایک اور چیز بھی ملے گی جو تمہیں پسند ہے اور
 وہ ہے اللہ کی مدد اور جلد فتح ، لہذا مومنوں کو یہ خوشخبری
 (سورہ صف - آیت ۱۳) سنارو۔

وَ سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ .

جہاد و شہادت

أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ. وَالَّذِينَ
كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ. فَقَاتِلُوا
أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ. إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا.

”جو ایمان لائے ہیں وہ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں۔

اور جو منکر ہیں وہ لڑتے ہیں طاغوت کی راہ میں۔ پس

لڑو شیطان کے ساتھیوں سے۔ یقیناً شیطان کا پھیلایا

ہو اجال کمزور ہے“ (سورہ نسا۔ آیت ۷۶)

جن اہم اسلامی موضوعات پر اکثر بحث ہوتی رہی ہے ان میں

سے ایک جہاد کا موضوع ہے۔ قرآن مجید کی بیشتر آیات پر اصحح طریقے

سے غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہر چند آیات کے بعد ایک آیت میں جہاد کا حکم موجود ہے۔ ایک طرف یہ کہ جو آیات اعتقادی، اجتماعی اور اخلاقی اصولوں اور احکام کے بارے میں آئی ہیں ان میں کسی نہ کسی عنوان سے جنگ اور جہاد کا تذکرہ ہے تو دوسری طرف گزشتہ چند صدیوں سے اسلام کے خلاف جو پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اس کا تعلق بھی مسلمانوں کی پیش قدمیوں، جنگوں اور فتوحات سے ہے۔ یہاں تک کہ اس غلط پروپیگنڈے نے کم و بیش ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو متاثر کیا ہے۔ مسلم اور غیر مسلم محققین میں جو اہل انصاف ہیں انہوں نے بھی دفاع اور جہاد کے اسلامی اصولوں پر کتابیں لکھی ہیں۔

اسلام میں جہاد کا کیا مطلب ہے اور اسلام نے کیسے ترقی کی؟ کیا جویریۃ العَرَب میں کوئی عظیم انقلاب آیا تھا؟ اس فکری، اخلاقی اور اجتماعی انقلاب میں طرفین کا کس قدر جانی نقصان ہوا؟ صدر اسلام کی ابتدائی جنگیں دفاعی نوعیت کی تھیں یا ان کا مقصد جارحانہ پیش قدمی تھا؟ یہ سب اپنی جگہ اہم سوالات ہیں لیکن اگر ہم ان تمام امور پر بحث شروع کر دیں تو اندیشہ ہے کہ ہم اپنے اصل مقصد سے ہٹ جائیں گے اور جو مطالب اس وقت بیان کرنا مقصود ہیں وہ رہ جائیں گے مذہبی اور اجتماعی احکام اور قوانین و قواعد سے قطع نظر، دفاع ایک فطری اور نفسیاتی معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں ایک اصول رکھا ہے، ایک قوت پیدا کی ہے جسے قوت غضبیہ کہا جاتا ہے۔ یہ قوت جانوروں میں بھی مختلف شکلوں میں موجود ہے اور اس کا مقصد اپنی زندگی اور اپنے حق کا دفاع ہے۔ ہر جاندار کو زندہ رہنے کا حق ہے اور اس حق کے

دفاع کے لیے فطری طور پر وہ اپنے اعضاء و جوارح سے کام لیتا ہے پُر دکار
عالم نے یہ قوت نہ صرف ہر جاندار کی فطرت میں ودیعت کی ہے بلکہ نباتات
میں بھی یہ قوت موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نباتات کی بعض اقسام تو
اس لیے ہیں کہ دوسرے جاندار ان کے پھولوں اور پھولوں سے استفادہ
کریں اور بعض کا وجود صرف بقائے نفس اور افزائش کے لیے ہے گو دوسرے
ان کی دلکشی اور خوبصورتی سے محفوظ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ پھلدار
درختوں میں سخت اور خشک کانٹے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ پھولوں میں
بھی تیز کانٹے ہوتے ہیں۔ پھولوں کے گرد خنجر نما کانٹے پھول کی اس پائنی
قوت کی نشان دہی کرتے ہیں جو زبانِ حال کہتی ہے کہ میری زیبائی،
رُخنائی، نزاکت، نہک اور خوشبو کا تقاضا ہے کہ کسی جفاکار کا ہاتھ مجھ
تک نہ پہنچ سکے۔

کل کے جلسے میں ایک نوجوان نے کچھ شعر بڑھے تھے۔ مجھے ان میں
سے دو شعر یاد رہ گئے، پہلا شعر میں بھول گیا ہوں۔ بہر حال کسی نے کیا
خوب کہا ہے۔

خواری خلیلِ درونی آرد
بیداد گری زبونی آرد
می باش چوں خارِ حربہ بردوش
تاخرین گلِ کشی در آغوش

لہ یہ شعر نظامی گنجوی کے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے۔
تا چند چون تک فرزدہ بودن چون موش در آب مرزدہ بودن

”ذلت کی زندگی سے آدمی بے چیننی کا شکار ہو جاتا ہے اور ظلم و ستم کے نتیجے میں بے بس اور لاچار ہو کر رہ جاتا ہے۔ بچوں کا کچھنا اگر گود میں لینے کی خواہش ہے تو کانٹے کی طرح مسخ اور دفاع کے لیے تیار رہو۔“

یہ اشعار واقعی از روئے بلاغت ایک طرح سے معجزہ ہیں۔ شاعرانہ پیرائے میں ایک حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ذلت خواری سے آدمی کا نفسیاتی توازن بگڑ جاتا ہے۔ جو لوگ ذلت و زبونی کی زندگی بسر کرتے ہیں، ممکن ہے کہ وہ حقائق کا بخوبی ادراک کر لیں لیکن وہ اپنے ہاتھ اور زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ یہی خلک کا مطلب ہے۔ واقعی اس کی اس سے بہتر تعبیر ممکن نہیں۔ خلک سے مراد یہ ہے کہ آدمی کی سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے کی قوتوں میں ہم آہنگی باقی نہیں رہتی۔ ذلت نفسیاتی خلل پیدا کرتی ہے۔

پھول اگر اپنی تازگی اور حسن برقرار رکھنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ شاخ گل پر قائم رہے تو ضروری ہے کہ کانٹے کسی جھکا کار کا ہاتھ اس تک نہ پہنچنے دیں۔ پس یہی وہ فطری قانون مدافعت ہے جو جانوروں میں سینٹوں، پنچوں اور دانٹوں کی صورت میں اور انسانوں میں قوت غضبیبہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

چونکہ انسان کو عقل عطا کی گئی ہے جو اس کی تمام فطری قوتوں سے صحیح کام لینے کی ذمہ دار ہے اس لیے انسان اپنی قوت غضبیبہ کو اپنے حق، اپنے ناموس، اپنی عورت اور اپنے قومی مفاد کی حفاظت کے لیے استعمال کرتا ہے۔

اسی بنا پر اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ کوئی مَقْنَن یا کوئی پیغمبر آکر یہ کہتا ہے کہ کسی قوم سے جنگ اور دفاع کی صلاحیت قطعاً ختم کر دی جانی چاہیے تو یہ بالکل ایسی ہی بات ہوگی جیسے کوئی مُصلِح آکر یہ کہے کہ چونکہ شہوانی قوت بد عنوانیوں اور بسا اوقات تکلیف کا باعث بنتی ہے، اس لیے عورتوں اور مردوں کی اس صلاحیت کو یکسر ختم کر دیا جائے۔ اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوتِ غضبیہ انسان میں باقی رہنی چاہیے، البتہ یہ ضرور ہے کہ اسے صحیح راہ پر ڈالا جائے۔

جس طرح کہ پروردگار عالم نے انسان میں مختلف قوتیں اور صلاحیتیں پیدا کی ہیں اسی طرح یہ ہدایت بھی کی ہے کہ ان کو صحیح طریقے سے آدمی کی بھلائی اور فائدے کے لیے استعمال کیا جائے۔

مثلاً شہوانی قوت کا مقصد بقائے نوعِ انسانی ہے، اسی طرح انسان میں غذا کی خواہش اور اشتہاء پیدا کی گئی تاکہ وہ اتنا کھائے جس سے اس کے جسم اور جان کا رشتہ قائم رہے۔ اگر شہوانی قوت کا صحیح استعمال نہیں کیا جائے گا تو یہی قوت بقائے نوع کے بجائے فنا کے نوع کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ پُر خوری اور شہوت رانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی بجائے اس کے کہ اسٹی یا سو سال جیے، تیس اور چالیس سال کی عمر میں ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جو ایک طرح کی خودکشی ہے۔ شہوانی قوت کا اگر ناجائز استعمال کیا جائے تو تولید و تناسل کے بجائے آدمی آنتھک اور سوزاک میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے بچے پیدا کرنے کی قوت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

یہی حال قوتِ غضبیہ کا ہے۔ آدمی میں جب اس قوت کا ظہور

ہو تو اسے چاہیے کہ اس ہتھیار سے مناسب کام لے کر اپنے حق، اپنے
 ناموس، اپنی عزت و شرافت اور اپنے ملک کا دفاع کرے لیکن پروردگار
 عالم نے اس قوت کا جو مَصْرُف تجویز کیا ہے اگر اس کے خلاف عمل کیا
 جائے مثلاً بلاوجہ طرح طرح کے بہانوں سے جنگیں چھیڑ دی جائیں یا
 قومیت کے نام پر کشمور کشائی اور دُوسروں کے علاقوں پر غاصبانہ قبضے
 کی کوشش کی جائے تو یہی قوت نسل کشی کا ذریعہ بن جائے گی۔ چونکہ
 انسان میں قوتِ غَضَبِیہ موجود ہے اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس
 کو قاعدے کا پابند کیا جائے اور یہ طے کیا جائے کہ اس کے اظہار
 کی کیا شکل ہونی چاہیے۔ اگر مذہب اور قانون کا وجود نہ ہوتا جب
 بھی دُنیا کے عقلاء اور نیکوکار یہ خواہش کرتے کہ مل بیٹھ کر کوئی اصلاح
 کی صورت نکالی جائے۔ رہا یہ سوال کہ وہ کیا کرتے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ
 ممکن ہے وہ کوئی ایسی ترکیب سوچ لیتے کہ دُنیا سے جنگ کو بالکل
 ہی مٹا دیا جاتا لیکن یہ صرف کہنے کی بات ہے۔ آج بھی ایسے دعوے
 کیے جاتے ہیں، تخفیف و تحدیدِ اسلحہ کی کمیٹیاں اور مصالحتی مشن
 دن رات کام کرتے رہتے ہیں مگر صرف بالائے زمین، ایوانوں میں اور
 کمروں میں، مگر ساتھ ہی زیر زمین کارخانے بڑی تیزی سے تباہ کُن
 اور ہلک ترین اسلحہ بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ اوپر امن، صلح،
 جنگ پر پابندی لگانے اور ایٹمی تجربے بند کرنے کی باتیں ہوتی رہتی
 ہیں اور ان ہی لوگوں کے قدموں کے عین نیچے ایٹم بم بنتے رہتے ہیں۔
 پھر کیا کرنا چاہیے؟

یہ کرنا چاہیے کہ قوتِ غَضَبِیہ راہِ حق میں صرف ہو۔ اسلام یہی

کہتا ہے۔

اسلام نے جہادِ وقتِ حال کو جہاد کا نام دیا ہے، ساتھ ہی
فِي سَبِيلِ اللّٰهِ کی قید لگا دی ہے۔ قرآن، حدیث اور ہماری دینی
تعلیمات میں جہادِ فِی سَبِيلِ اللّٰهِ کا حکم آیا ہے۔ فِی سَبِيلِ اللّٰهِ کے معنی
ہیں ”خُدا کی راہ میں“۔

اب خُدا کی راہ کہاں ہے؟ کس طرف ہے؟ آسمان کی طرف ہے
کعبہ کی سمت ہے یا بیت المقدس کی جانب۔ دراصل راہِ خُدا سے مُراد
ہے عام انسانی معاشرے کی بھلائی اور بہتری کا راستا یعنی انصاف
اور حق کا راستا۔ انسانی آزادی کا راستا جس میں چند لوگ یا کسی ایک
طبقہ کے افراد عوام کی صلاحیتوں پر اس طرح مسلط نہ ہو جائیں کہ وہ
معاشرے کی سوج کا راستا مسدود کر دیں اور عوام کو ان قدر قی و سائل
تک رسائی نہ حاصل کرنے دیں جو خُداوندِ عالم نے سب کے لیے بنائے
ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو باطنی قوتوں اور رُوحوانی صلاحیتوں سے نوازا
ہے۔ اس نے یہ ہوا، یہ فضا، یہ روشنی سب کے فائدے کے لیے
پیدا کی ہے تاکہ سب لوگ اپنی صلاحیتوں اور جسمانی و رُوحوانی قوتوں
سے استفادہ کر سکیں۔ اسی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے جَاهِدُوا
فِي سَبِيلِ اللّٰهِ کا حکم آیا ہے۔ جہاد کرو اور وہ بھی راہِ خُدا میں۔
ہمارے فقہی قانون کا ایک باب بَابُ الْجِهَادِ بھی ہے، اس
کو ملاحظہ فرمائیے۔ جہاد پر عبادات کے ضمن میں بحث کی جاتی ہے۔
ہماری فقہ کے دو حصے ہیں: ایک حصہ عبادات سے متعلق ہے، دوسرا
مُعَامَلَات سے۔ عبادات اور مُعَامَلَات میں فرق یہ ہے کہ عبادات میں

قربت کا قصد لازمی ہے: جیسے نماز، روزہ، حج، زکات، خمس، امر بالمعروف
 نہی عن المنکر اور جہاد۔ یہ سب عبادات ہیں۔ لہذا اگر کوئی شخص تلوار
 ہاتھ میں لے کر کفار سے جا کر لڑے مگر قربت کی نیت نہ ہو تو اُسے ثواب
 نہیں ملے گا، وہ اگر قتل اور شہید بھی ہو جائے جب بھی اجر سے محروم
 رہے گا۔ ثواب صرف اسی صورت میں ہوگا جب قربت کے قصد سے
 جہاد کرے۔ قربت کے معنی ہیں ”خدا سے نزدیکی“۔

آئیے پھر دیکھیں کہ فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے؟ خدا کہاں
 ہے جو ہم اس سے نزدیک ہو جائیں؟

خدا حاضر و ناظر ہے۔ اس کے ارادہ و صفات کا عالم میں ظہور
 ہے۔ افراد اور معاشرے کو اس کی صفات سے مُتَّصِف کرنے سے اس کی
 قربت حاصل ہوتی ہے۔ خدا عادل ہے، حکیم ہے، اس لیے عدل اور
 حکمت کو بروئے کار لانے اور رحمت اور خیر و برکت کے سرچشموں سے
 لوگوں کو مستفید کرنا ہی جہاد فی سبیل اللہ ہے، اسی لیے جہاد کو عبادات
 کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

جب ہم قرآنی آیات پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں قرآن میں
 جہاں بھی قَاتِلُوا یا جَاهِدُوا کا لفظ آیا ہے اس کے ساتھ
 فِي سَبِيلِ اللَّهِ کی قید ضرور ہے۔

اس آیت میں جو میں نے بطور عنوان ابتداء میں تلاوت کی تھی
 اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: الَّذِينَ آمَنُوا يَمُوتُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
 الَّذِينَ كَفَرُوا يَمُوتُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ. فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ
 الشَّيْطَانِ. إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا. گویا اس قضیہ کا پہلا

حصہ تو ایک حقیقتِ مسلمہ ہے، دُنیا میں جدال و قتال کا نہ صرف وجود ہے بلکہ یہ انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اصل بات دوسرا حصہ ہے۔ دُنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں: ایک الَّذِينَ آمَنُوا، دوسرے الَّذِينَ كَفَرُوا۔

زندگی جنگ اور جدوجہد سے عبارت ہے۔ اب جو لوگ باایمان ہیں اور جن کا ہدف اَرْفَعْ وَاَعْلَى ہے وہ راہِ حُدَا میں جنگ کرتے ہیں اور جن لوگوں میں یہ بات نہیں وہ راہِ طاعوت میں لڑتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے کہ ”طاعوت“ کے کیا معنی ہیں؟ یہ کس قسم کا لفظ ہے؟ جو لوگ قرآن پڑھتے ہیں کبھی انھوں نے اس لفظ پر غور کیا؟ طاعوتِ طُغْيَان سے مُبَالَغَة کا صیغہ ہے۔ طَغَى الصَّاعِقُ معنی ہیں کہ پانی اتنا زیادہ ہو گیا اور اس کا دباؤ اس قدر بڑھ گیا کہ وہ اپنی اصل گزرگاہ سے باہر اُمنڈ پڑا، سیلاب آ گیا جس نے اطراف کے مکانات کو تباہ کر دیا اور کھیتوں اور درختوں کو اُجھاڑ دیا۔ یہ معنی ہیں پانی کی طُغْيَان کے۔

طاعوت کے معنی ہیں وہ خود سر جو اپنی حد سے تجاوز کر جاتے۔ مُسْتَبِدِّ اور ڈکٹیٹر کے الفاظ جو یونانی فلاسفر اور علمائے عمرانیات نے ایجاد کیے ہیں اور اب بھی استعمال ہوتے ہیں، ان سے یہ لفظ زیادہ جامع ہے کیونکہ مُسْتَبِدِّ جس کے معنی ہیں خود سر حاکم، تو ممکن ہے کہ وہ خود اپنے ہی اُپر حکومت کرتا ہو اور اپنی ہی خواہشات کو دبا کر رکھتا ہو۔ مگر طاعوت وہ خود سر اور رکش ہے جو تمام معاشرتی حدود سے تجاوز کر جائے، سب کے حقوق کو یا مال کرے، اس کی نفسانی اور شہوانی خواہشات اس قدر حد

سے بڑھ جائیں کہ وہ تمام حدوں کو توڑ ڈالے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ طاعت سے مراد بُت ہے۔ یہ درست ہے کہ بُت بھی طاعت کا ایک مصداق ہے لیکن یہ معنی فی نفسہ لغت کے لحاظ سے کچھ زیادہ صحیح نہیں، نہ عام طور پر یہ لفظ ان معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

لُغْتٌ مِّنْهُ :

الطَّاعِيَةُ : الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ .

الطَّاعُونَ : كُلُّ مُتَعَدٍّ . كُلُّ رَأْسٍ ضَلَالَةٍ .

شَيْطَانُ الصَّارِفِ عَنِ الْخَيْرِ .

الْأَحْمَقُ : نَصَبُ مُلُوكِ الرُّومِ وَكُلِّ مَلِكٍ

طَائِعِيَةٍ : خُودَسَر - ظَالِم - كَهْمَنْدِي -

طاعت : جو شخص حد سے گزر جائے۔ سخت گمراہ۔

شیطان جو نیک کاموں سے روکتا ہو۔

أَحْمَقٌ : شَاهَانِ رُومٍ يَأْكُسِي أَوْرَادَ بَدِشَاهِ كَابُتٍ يَأْمُرُ بِمَجْتَمَعِهِ

سورہ نسا کی ساٹھویں آیت میں ارشاد باری ہے :

يُرِيدُونَ أَن يُتَّحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا

أَن يَكْفُرُوا بِهِ .

”یہ لوگ اپنے مقدمے طاعت کے پاس لے جانا چاہتے

ہیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کو نہ مانیں“

اگر طاعت سے مراد بُت ہو تو کوئی اپنا مقدمہ فیصلے کے لیے بُت

کے پاس نہیں لے جاتا۔ معلوم ہوا کہ اس سے مراد بُت نہیں۔

قرآن شریف میں شاید نوجگہ یا سات جگہ طاعت کا لفظ آیا ہے

یہ لفظ سورہ بقرہ میں دو بار تو آیت الکرسی ہی میں آیا ہے، جیسا کہ اسلوباً ہے آیت الکرسی پڑھنے کا بڑا ثواب ہے خصوصاً نمازوں کے بعد :

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ
فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدْ
اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا
وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ. اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ. وَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْا اَوْلِيَآئُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ
النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمَاتِ.

”دین میں زبردستی نہیں کیونکہ ہدایت یقیناً کفر ہی سے ممتاز ہو چکی ہے، تو جو کوئی طاغوت کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لے آئے، اس نے ایک بڑی مضبوط رستی تھام لی جو کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتی۔ اللہ بڑا سننے والا جاننے والا ہے۔ اللہ حامی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے، ان کو کفر کی تاریکیوں سے نکال کر نور اسلام کی طرف لاتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے ساتھی طاغوت ہیں جو ان کو نور اسلام سے نکال کر کفر کی تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔“
(سورہ بقرہ - آیت ۲۵۶)

آدمی دو حال سے خالی نہیں : یا تو اُس کے اعمال، اُس کا ارادہ اور اُس کی سوچ خدا کے ہاتھ میں ہوگی، اس صورت میں وہ بدترین ہوا ہوگی کی تاریکیوں سے نکل کر علم و معرفت کی روشنی میں آجائے گا، اسے اپنا

مستقبل روشن نظر آنے لگے گا، ورنہ طاغوت اس پر حاوی ہو جائے گا، انسان بغیر کسی سرپرست اور ولی کے نہیں رہ سکتا، یا اس کا ولی خدا ہوگا یا طاغوت۔ پیغمبر اور امام بھی ولی اور سرپرست ہیں، ان کو ہم اس لیے ولی کہتے ہیں کہ یہ ارادۂ خداوندی کو نافذ کرنے والے ہیں، اس لیے وہ اللہ کے ولی ہیں۔

رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے:

أَلَسْتُ أَوْلَىٰ بِكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ. کیا میں تم سے
اس سے بھی زیادہ نزدیک نہیں ہوں جتنے تم خود اپنے آپ سے
ہو؟

تم بت پرست بنا چاہتے تھے، تم جاہل رہنا چاہتے تھے، تم ایک دوسرے کا خون بہانا چاہتے تھے، تم کمزور، ذلیل، بے کس و بے بس رہنا اور ہمسایہ قوموں کی کاسہ لیس کرنا چاہتے تھے، تم نے دیکھا کہ جب میں نے تمہارے معاملات اپنے ہاتھ میں لیے تو تمہیں سب کچھ مل گیا۔ روزِ غدیر رسولِ خداؐ نے اسی طرح اتمامِ حجت کیا تھا، کیونکہ جو انقلاب آچکا تھا وہ سب کی آنکھوں کے سامنے تھا، سب اس سے واقف تھے۔ اس لیے آپ نے فرمایا: أَلَسْتُ أَوْلَىٰ بِكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ.

اگر آدمی اللہ اور اولیاء کی تعلیم پر نہیں چلے گا تو پھر لائحہ عمل وہ طاغوت کے زیرِ تصرف آجائے گا۔ اس کی علامت اور نتیجہ بھی بیان کر دیا گیا ہے: يُخْرِجُونَهُمْ مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ طاغوت آہستہ آہستہ اس کو نورِ فطرت اور عقل و ادراک کی روشنی سے محروم کر کے جہالت، بؤاہوس، عیاشی اور غلط سوچ کے اندھیروں میں دھکیں دے گا، جیسا کہ اس آیت میں

ارشاد ہے:

”الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ.

مومن اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔“

اس کے بِالْقَابِلِ کہا گیا ہے:

”وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ

کافر طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔“

اس دُنیا میں جنگ ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ اگر کبھی دُنیا سے جنگ ختم ہوگئی تو پھر یا تو یہ دُنیا ختم ہو جائے گی یا اس طرح بدل جائے گی کہ پھر وہ کوئی اور ہی دُنیا ہوگی یا یوں کہیے کہ اگر جنگ مٹ گئی تو انسانی فطرت ہی یکسر بدل جائے گی، اس صورت میں وہ کوئی اور ہی زندگی ہوگی۔ بہر حال اس دُنیا میں جب تک انسان کی موجودہ فطرت باقی ہے جنگ کسی نہ کسی صورت میں جاری رہے گی۔ فرق یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو ایمان سے محروم ہیں وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں خواہ وہ ظالم اور مکش کیوں نہ ہوں۔ حدود سے تجاوز کرنے والے بعد میں پوچھتے ہیں کہ اس جنگ کا مقصد کیا ہے؟ یہ ایک اور نکتہ ہوا۔

اب تک میں نے کتنے ہی نکات بیان کیے ہیں، مجھے ان کی تعداد

یاد نہیں۔

پہلا نکتہ تو یہ تھا کہ جنگ انسان کی اصل فطرت اور جبلت میں شامل ہے اور یہ ممکن نہیں کہ جنگ کا دُنیا سے خاتمہ ہو جائے۔
دوسرا نکتہ یہ تھا کہ مذہب جنگ کے خلاف نہیں۔ مذہب سے

میری مراد دینِ کامل ہے مسیحیت نہیں۔ مسیحیت بظاہر تو یقین کرتی ہے کہ جنگ نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بات مشہور ہے کہ حضرت مسیحؑ نے کہا: ”اگر تمہارے رخصسار پر کوئی تھپڑ مارے تو دوسرا رخصسار بھی اس کے سامنے کر دو، لیکن کیا عملاً کبھی ایسا ہوتا رہا ہے؟ یہ دُنیا میں جو جنگیں ہوتی رہتی ہیں، یہ کہاں سے آئیں؟ کیا ہم مسلمانوں کی ایجاد ہیں؟ یہ ساری توں ریزیاں جو پچھلی ایک صدی میں ہوتیں خواہ داخلی جنگوں کی صورت میں ہوں خواہ عالمگیر جنگوں کی شکل میں، ان کا ذمہ دار کون تھا؟

دوسری طرف مسیحیت تو یہ بھی کہتی ہے کہ اگر خداوند خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتے ہو تو تجرّد کی زندگی اختیار کرو، نہ عورت شادی کرے نہ مرد۔ کیا کبھی اس پر عمل ہو سکا؟ کیا عیسائی یورپ شہوت رانی کا مرکز نہیں بن گیا؟ یہ اس پابندی کا ردّ عمل ہے عیسائیت کے نام پر صرف چند راہبوں اور راہبات نے خانقاہوں میں بیٹھ کر اپنے قلم سے جسمانی مُغفل کر لیے۔ اگر واقعی مسیحیت کا یہی حکم ہے تو یہ کوئی عارضی اور وقتی حکم ہوگا۔ ورنہ یہ جھوٹ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حضرت مسیحؑ کی تصدیق کرتا ہے، اس لیے یہی باور کرنا پڑے گا کہ اس طرح کی سب باتیں دروغ بے فروغ ہیں :

”رَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَا هَا عَلَيْهِمْ ۗ“

یہ رہبانیت جو ان لوگوں نے ایجاد کر لی ہے اس کا

ہم نے ان کو حکم نہیں دیا۔ (سورہ حدید۔ آیت ۲۷)

رہبانیت صرف تجرّد کی زندگی بسر کرنے کا ہی نام نہیں گوشہ نشینی

حق و صداقت کا دفاع نہ کرنا اور اپنی ہستی کے دفاع کے حق اور قانون سے دستبرداری بھی درحقیقت رہبانیت ہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ رہبانیت دنیا کا عام قانون نہیں بن سکتا۔

دنیا کا بندوبست صرف اسی قانون کے ذریعے سے ممکن ہے جو اول تو انسانی جبلت کی تعمیر اور فطرت انسانی کے مطابق معاشرے کی تنظیم کرے اور ساتھ ہی یہ بھی کہے کہ فطری رجحانات انسانی جبلت میں تو داخل ہیں لیکن ان کو قتل و غارت گری، لوٹ کھسوٹ، شہوت رانی، مُلک گیری اور استحصا ل کے لیے استعمال نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ ان کا استعمال صرف نیکی اور بھلائی کے لیے ہو۔ اپنے حق اور ناموس اور اپنے مُلک کا دفاع کرو۔ آئین و قوانین کا دفاع کرو۔ عوام کے حقوق کا دفاع کرو اس جبلت کو درجہ بدرجہ اسی سمت میں ترقی دو اور آگے بڑھاؤ۔

”وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَيَكُونَ
الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ. فَإِنَّ انْتَهُمَا فَلَاعْدُوَانِ الْأَعْلَى
الظَّالِمِينَ“

”تم ان کفار سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین خالص اللہ کا ہو جائے۔ اگر یہ لوگ باز آجائیں تو پھر کسی پر سختی نہیں بجز ظالموں کے“

(سورۃ بقرہ - آیت ۱۹۲ اور سورۃ انفال - آیت ۳۹)

یہ ہیں فی سبیل اللہ کے دو پہلو۔ ایک مثبت اور ایک منفی۔ لڑو مگر کسی مقصد کے لیے، ہر کشور کشائی اور مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے، نہیں، بلکہ حق کا پیغام لوگوں تک پہنچاؤ اور انھیں ظالموں کی غلامی

سے آزاد کراؤ، دوسرے انسانی زندگی کی دشواریوں کو دُور کرو۔ وہ طاقتیں
 اور طبقے جو عوام کے حقوق کے مخالف ہیں جو عوام کے حقوق اور ان کی
 آواز کو دباتے ہیں ان کو ختم کرو۔ یہ ہیں معنی فی سبیل اللہ کے! لوگوں کو
 گھٹن سے نجات دلاؤ تاکہ لوگ سرچشمہ کائنات یعنی خدائے واحد سے آشنا
 ہو سکیں۔ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً ۗ ان طاقتور طبقوں سے لڑ جاؤ جو اپنے
 مفاد کے لیے کمزوروں کو دھوکا دیتے ہیں اور ان کے لیے مُصیبت بنتے ہوئے
 ہیں، جو لوگوں کو راہِ حق سے ہٹا کر باطل کے پھندے میں پھنساتے ہیں اور
 توحید سے منحرف کر کے شرک، بت پرستی اور طاقت کی پوجا کے راستے پر
 ڈالتے ہیں۔ یہ ہیں انسانی زندگی کی وہ دشواریاں اور فتنے جن کو راستے سے
 ہٹانا ضروری ہے تاکہ انسانیت ترقی کر سکے اور وہ خاص طبقے نابود ہو جائیں
 جو عوام کے خون پسینے کی کمانی سے گلچھڑے اڑاتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں
 انسانوں کے حقوق اس طرح پامال کرتے ہیں جیسے قیصر و کسریٰ کیا کرتے تھے۔
 ایک مسلمان سپاہی نے کہا تھا: بَعَثْنَا لِنُخْرِجَ الْأُمَّةَ مِنْ ذُلِّ
 الْأَدْيَانِ إِلَى عِزِّ الْأَسْلَافِ۔ جب یہ برہنہ نیا عرب، ایرانی فوج کے کمانڈر
 کے سامنے پیش ہوا تو ایرانی کمانڈر نے پوچھا کہ ”کیا تم اس ملک پر قبضہ
 کرنے آئے ہو؟ مال لوٹنے کے لیے آئے ہو؟ بھوکے ہو؟ ننگے ہو؟ ہم
 تم کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیں گے، تمہارے افسروں کو بھی روپے دیں گے
 اور تمہارے سپاہیوں کو بھی۔ جاؤ اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ۔“ اس نے
 اپنی دانست میں مسلمان سپاہی کو خواصاً متاثر کر لیا تھا۔ مگر دیکھیے اُس
 نے کیا جواب دیا اور اس کے الفاظ کس طرح تاریخ میں ثبت ہو گئے۔
 اُس مسلمان سپاہی نے ایرانی کمانڈر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لیک

بڑی معنی خیز بات کہی۔ اس نے کہا کہ
 ”ہم اپنے پیغمبرؐ کی طرف سے مأمور ہیں کہ دُنیا کی تُوں
 کو انسان کے بنائے ہوئے قوانین اور ان مذاہب سے نجات
 دلائیں جو بعض خاص طبقوں کے مفاد کے لیے وضع کیے گئے
 ہیں اور اس کے بجائے ہر ایک کو اس کا حق دلائیں اور
 عام لوگوں کو اسلام کے ذریعے سے عزت و افتخار کے درجے
 تک پہنچائیں اِلٰی عِزِّ الْاِسْلَامِ“ ۱۷

یہ ہے اسلامی جہاد اور یہ معنی ہیں جہاد کے۔ یعنی حق کو پھیلانے اور
 اور اپنا حق لینے کے لیے کوشش کرنا۔ اسلام اس جدوجہد کو جنگ اور قتال
 نہیں کہتا بلکہ اس کو جہاد کا نام دیتا ہے یعنی حق کے لیے کوشش۔
 فقہار جہاد کا تذکرہ عبادات کے ضمن میں کرتے ہیں اور اس کے لیے
 فِي سَبِيلِ اللّٰهِ کی شرط لگاتے ہیں۔

کسی نے رسولِ اکرمؐ سے پوچھا کہ اگر ایک شخص میدانِ جہاد میں اس لیے
 جائے کہ شاید کچھ مالِ غنیمت ہاتھ آجائے تو آپ نے تین بار فرمایا کہ اس
 کا خدا کے یہاں کوئی اجر نہیں۔ ایک اور شخص نے پوچھا کہ اگر کوئی شخص
 لڑائی پر اس لیے جائے کہ اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے یا اس لیے کہ لوگ
 اس کے کارنامے دیکھیں اور اس کو شہرت حاصل ہو تو کیا ایسا شخص مجاہد
 فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ہے؟ آپ نے فرمایا: ”مجاہد وہ ہے جو اس لیے جہاد کرے
 کہ (لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْكَلِمَا) اللہ کی بات بلند ہو اور اس کا نشانہ اور اثر
 یہی راہِ خدا ہے اور یہی معنی ہیں اسلامی جہاد کے۔ اس وقت

۱۷ جنگِ قادسیہ کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عمرؓ کے عہد (۶۳۶ء) میں لڑی گئی تھی۔ یہ فتحِ قادسیہ جنگ میں مارا گیا تھا۔

اس سلسلے کی تمام آیات کا مطالعہ کرنے اور ان پر گفتگو کرنے کا موقع نہیں۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ صدرِ اہل کے بعد مسلمانوں میں کبھی پیدا ہو گئی تھی۔ اموی خلفاء کے زمانے میں جس طرح اسلام کی دوسری ہر چیز منسوخ ہو گئی، اسلامی جہاد بھی منسوخ ہو گیا کیونکہ اس کا تعلق بھی اسلام کے بنیادی اصولوں سے ہے۔ انگریز مورخ کارلائل نے کیا خوب کہا ہے اس کے الفاظ تو مجھے یاد نہیں، بہر حال اس الزام سے کہ ”اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے“ وہ اسلام کا دفاع کرتے ہوئے کہتا ہے: (اس بات کو ذرا اور بلند زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اسلام حق ہے یا نہیں؟ اگر حق ہے، تو حیدر اور خدا پرستی کا ضابطہ ہے، اُس کا اپنا نظام ہے جس کی بنیاد منصفانہ قوانین پر ہے اور لوگوں کی بہتری اور فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے کا حکم دیتا ہے تو پھر یہ دین حق ہے اور خدا کی طرف سے ہے) اگر حق ہے تو پھر ضروری ہے کہ یہ پھیلے اور ترقی کرے، اگر تلوار سے نہ سہی تو دانتوں اور پنجوں سے سہی۔“ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام تلوار سے کیوں پھیلا؟ اصل سوال یہ ہے کہ حق پھیلا یا باطل؟ تمھاری دلیل یہ ہے کہ چونکہ تلوار سے پھیلا ہے اس لیے یہ مذہب باطل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں چونکہ یہ مذہب حق ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے فروغ کے لیے تلوار استعمال کی جائے۔ اُلٹی طرف سے کیوں سوچتے ہو؟ اگر تمھیں اسلام سے عناد نہیں ہے، اگر اس پر اہتمام لگانا اور یورپ کے مٹھی بھر متعصب عوام کی نظر میں اس کو داغدار کرنا نہیں چاہتے تو اس طرح بات کیوں کرتے ہو کہ اسلام کو پھیلانے کے لیے جنگیں لڑی گئیں، اس لیے اسلام باطل ہے۔ یوں کہو کہ چونکہ اسلام حق ہے اس لیے اس نے جنگ کا حکم

دیا ہے۔ "اگر کسی پودے پر پھول نہ آتے ہوں تو اس کے گرد کانٹے کیوں
 اگائے جائیں۔ اگر آدمی کو زندہ رہنے اور اپنا دفاع کرنے کا انفرادی حق
 نہیں ہے تو پھر اسے قوتِ غضبِ کیوں دی گئی ہے۔ جب آدمی کو یہ قوت
 دی گئی ہے تو اس کا ایک حق قائم ہو گیا اور جب اس کا حق ہے تو پھر
 ضروری ہے کہ وہ اس قوت کو استعمال کرے۔ البتہ کسی باطل مقصد
 کے لیے نہیں بلکہ اپنے حق کا دفاع کرنے کے لیے۔ یہی جہاد کی حقیقت ہے
 اس لیے یہ بات قطعاً ناقابلِ یقین ہے کہ ایک مذہب جو حق ہو اور خدا
 کی طرف سے آیا ہو اس کا دفاعی اور تبلیغی پہلو نہ ہو اور اس کی ترقی کے
 لیے انتظام نہ ہو۔ اگر کوئی ایسا دین آتا جس کا اپنا دفاعی نظام نہ ہوتا تو
 ہم یہ نہیں مان سکتے کہ وہ یہ کہتا کہ وہ خدا کی طرف سے ہے، انسانیت
 کی بھلائی کے لیے ہے، تاقیامت لوگوں کی ہدایت اور بہبود اس کا مقصد
 ہے۔

اسلام وہ دین ہے جو انسانیت کی اصلاح چاہتا ہے، آدمی کا رخ
 حیوانی خواہشات سے موڑ کر اس کو براہِ راست خدا کی طرف متوجہ کرتا ہے،
 دنیا میں عدل و انصاف کا بول بالا چاہتا ہے، مختلف قومی اور غیر قومی
 بہانوں سے جو صاحبانِ اقتدار لوگوں کو قتل و غارت گری اور آدم کشی کے
 لیے آلہ کار بناتے ہیں ان کا خاتمہ چاہتا ہے تاکہ یَكُونِ الدِّينَ كُلَّهُ لِّلَّهِ
 دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے، ایک ایسا دین آئے اور وہ اپنی
 حقیقی روح کے ساتھ ہمارا دستورِ حیات بن جائے۔ اس کے بعد میں یہ
 کہنا زیب دیتا ہے کہ خدا ایک ہے اور اس نے ہماری ہدایت کے لیے
 ایک رسول بھی بھیجا ہے۔

اگر کوئی آکر تم سے پوچھے کہ اس بگڑی ہوئی دُنیا کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے تو اسے بتاؤ کہ اصلاح کی صورت یہ ہے کہ دُنیا والے — اُن ظالموں کے خلاف جنگ کریں جو لوگوں کی جان، مال اور آبرو سے کھیلتے ہیں اور ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں — ایک ایسی مقدس جنگ لڑیں جس کے ذریعے سے اس دَور کے فرعونوں کا وجود صفحہ ہستی سے مٹ جائے، تو یہ کوئی بُری بات نہیں۔ یہ ہے دین۔

جب کوئی کہے کہ ”یہ حق ہے“ تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ہاتھ میں تلوار دے کر کہے کہ ”یہ حق ہے“ اور اس حق کو آگے بڑھنا چاہیے ظاہر ہے کہ لوگ پوچھیں گے کہ کہاں تک آگے بڑھنا چاہیے تو انھیں بتاؤ کہ جہاں تک دین بڑھتا جائے اور باطل حق کے آگے تسلیم مہجائے۔ اب یہ لوگ مسلمان اور تمھارے بھائی ہیں۔

لیکن اگر وہ یہ کہیں کہ ہم اپنے عقائد پر باقی رہنا چاہتے ہیں، اپنے طریقے سے عبادت کریں گے لیکن عام اسلامی قانون کے تابع ہونا قبول کرتے ہیں تو ایسے لوگ ذمی ہیں۔

جو ذمی ہو گیا اس کے حقوق بھی وہی ہیں جو مسلمان کے ہیں۔ اب کوئی عرب یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ اسلام کا ظہور میری سر زمین سے ہوا ہے اس لیے مجھے عجم پر فوقیت حاصل ہے۔ بلکہ ایک عجمی جب مسلمان ہو گیا تو وہ بھی عربی کے برابر ہو گیا۔ اور اگر وہ مُقابلتہً زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے تو عربی سے بڑھ جائے گا۔ اسی طرح جو شخص اسلام کے اصول اور اس کی تعلیمات سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے اس کا درجہ بلند ہے۔ یہ ہے کسوٹی۔ کوئی حبیبی ہو، رومی ہو یا زنجباری ہو، کالا ہو یا گورا، جس نے

سبیل سکینہ

خیر و برکت کا دار و مدار ہے

حقیقت کو تسلیم کر لیا، مسلمان ہو گیا۔ پھر سب مسلمان تمام حقوق میں مساوی ہیں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی سے یہ کہے کہ چونکہ میں عرب ہوں اور تم سے پہلے مسلمان ہوا ہوں اس لیے میرا حق مقدم ہے اور چونکہ تم مجھ سے بعد میں اسلام لائے ہو اس لیے تمہارا حق موخر ہے۔

صدرِ اول میں اسلام میں جو بگاڑ پیدا ہو گیا تھا، اس کی بنیاد یہی تھی کہ عرب آہستہ آہستہ اس غرور میں مبتلا ہو گئے کہ ہم سابقِ الاسلام ہیں اور اسلام کا سرچشمہ ہمارا ہی ملک ہے، اس لیے ہمارا حق قائل ہے۔ اس بنا پر عربوں نے دوسروں کے حقوق غصب کرنے شروع کر دیے اور انہیں پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ یہی قومی اور نسلی تعصب بعد میں بھی مصلحتوں کا باعث بنتا رہا۔

آج بھی غیر ملکی حکام اور غیر ملکی ادارے جو مسلمانوں سے سُووِظَن رکھتے ہیں، ان میں چھوٹ ڈالتے ہیں، ان کے سامنے رُکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں، اس کا سبب بھی وہی قومی اور نسلی تعصب ہے۔ کاش کہ صدرِ اول کے پابندِ اسلام مسلمانوں کی طرح ہم سب بھائی بھائی ہوں، سب برابر ہوں اگر جنگ کریں تو اس لیے کہ مُسْتَضْعَفِین کو آزادی دلائیں۔

خلاصہ یہ کہ کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا مذہب ہو جو خدا کی طرف سے آیا ہو، لیکن اس کی ترقی اور دفاع کے لیے کوئی حکم نہ دیا گیا ہو؟ اگر ہم ایسا فرض کرنا بھی چاہیں تو درست نہیں ہوگا۔ آخر جنگ کس سے کی جائے؟ لڑائی کس کے خلاف ہو؟ کس کے خلاف جہاد کا حکم ہے؟

جہاد سے مراد یہ ہے کہ پہلے اسلام کی دعوت دی جائے چُونکہ یہ

دعوتِ فطرت کے عین مطابق ہے اس لیے لوگ اسے ضرور قبول کریں گے خاص طور سے وہ لوگ جو آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ایک گروہ جس میں حکمران ٹولہ اور مفاد پرست طبقہ شامل ہے اور جو جانتا ہے کہ اس کا مفاد اسی میں ہے کہ لوگ حق پر جمع نہ ہو جائیں، قدرتی طور پر اس دعوت کی مزاحمت کرتا ہے اور یہیں سے جنگ چھڑ جاتی ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس مفاد پرست طبقہ کو ختم کر دیا جائے۔ اس طرح وہ لوگ ابھرتے ہیں جن میں اسلامی صلاحیتیں کارفرما ہوتی ہیں۔

کیا ایران میں یہی کچھ نہیں ہوا تھا۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ عوامِ اسلام کی دعوت سے خوش تھے، صرف اُن فوجی سرداروں نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا تھا جو حکمرانوں کے وظیفہ خوار تھے، ورنہ عوامِ مسلمانوں کی مدد کر رہے تھے۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ روم اور ایران کے عوام نے مسلمانوں سے تعاون کیا اور ان کا ساتھ دیا۔ عوام کہتے تھے کہ ”اگر تمہارا نعرہ واقعی اللہ اکبر ہے تو آ جاؤ ہم سب سر آنکھوں پر۔ خدا کے نزدیک سب آدمی برابر ہیں اس لیے ہم تمہاری مدد کے لیے موجود ہیں“ وہ بھی مسلمانوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہو گئے، تاکہ اس فرسودہ اور بدعنوان طبقہ کو ہٹایا جاسکے جس نے لوگوں کی سوچ اور ان کی صلاحیتوں کو دبا رکھا تھا۔ اس کے نتیجے میں یکایک ایرانیوں کی صلاحیتیں بروئے کار آنے لگیں۔ قبل از اسلام اور بعد از اسلام کی ایرانی تاریخ کا ایک ایک ورق الٹ کر دیکھیے، یہ سب شعراء، یہ سب علماء، یہ سب مصنفین، یہ سب محققین، یہ سب خطیب یکایک کیسے پیدا ہو گئے؟ یہ اسلام کی برکت تھی جس نے اس گندے معاشرے کو دھو کر صاف کر دیا۔

اسلام کہتا ہے کہ حق کی تبلیغ کرو۔ اگر کوئی رُکاوٹ پیش آتی ہے تو اس رُکاوٹ کو دور کر دو۔ اگر مخالفین تم پر حملہ کریں تو تمہیں بھی اپنے دفاع کا حق ہے، ورنہ تمہارا مقصد اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچانا ہے چونکہ اسلام خدا کا دین ہے، اس لیے ہر مُنْزَاہت اور رُکاوٹ کو دور کرنا ضروری ہے، دوسرا سوال دفاع کا ہے۔ اگر کُفَّار یا کوئی اور غیر مُلکِ طاقت کسی مُسلمان مُلک پر حملہ آور ہو تو اس صورت میں تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اسلامی مملکت کا دفاع کریں۔

اسی طرح جنگ کی دو قسمیں ہیں: ایک کا مقصد پیش رفت کرنا ہے جبکہ دوسری دفاعی جنگ ہے۔

جنگ اور جہاد کی ایک اور قسم بھی ہے، یہ داخل جنگ ہے۔ اگر کوئی مذہبی اقلیت اس مُلک میں مسلمانوں کی سرپرستی قبول کر کے ذمّی کا درجہ حاصل کر لے جہاں اسلامی حکومت قائم ہو، اسلامی قوانین نافذ ہوں اور اسلامی حدود کا اجرا ہوتا ہو اور جہاں کی حکومت کا کاروبار مسلمان ٹیکس دہندگان کے روپے سے چلتا ہو تو ایسے مُلک میں جو یہودی یا عیسائی اقلیت رہتی ہے اس کے بارے میں اسلام کہتا ہے کہ اگر ذمّی اپنی ذمّہ داری کی حدود میں رہتے ہیں اور اپنے عہد کے مطابق عمل کرتے ہیں تو وہ بھی کسی مُسلمان کی طرح اپنی عبادات آزادی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں۔

اگر ذمّی جو یہ ادا کریں تو اس کے بعد ان کی جان اور مال بھی اسی طرح محفوظ ہوں گے جس طرح کسی مُسلمان کے۔ کسی کو ان کے مال اور آہرو سے تعرض کا حق نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی کریں گے

تو پھر ذمّی نہیں رہیں گے، محارب (جنگجو باغی) بن جائیں گے۔ چونکہ انھوں نے مقررہ حدود سے تجاوز کیا ہے، اس لیے ان سے اسلامی مملکت کے اندر اس وقت تک جنگ کی جائے گی جب تک وہ حق اور قانون کی اطاعت اور دوبارہ اسلامی حکومت کی ماتحتی قبول نہ کر لیں۔

اب یہ ملاحظہ کر لیجیے کہ اسلامی فقہ کے مطابق ذمّی کی کیا ذمّات ریاں ہیں اور مسلمان کہاں تک ذمّی کے ساتھ حسن سلوک کے مکلف ہیں۔ یہ تفصیل ہماری فقہی کتابوں میں موجود ہے۔ میں علامہ علی علیہ الرحمہ کی کتاب مختصر النافع سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ ”ذمّی ہونے کی پانچ شرائط ہیں :

۱۔ ذمّی جزیہ ادا کرے یعنی ایک خاص ٹیکس اسلامی بیت المال کو دے تاکہ اس کے حقوق محفوظ ہو جائیں اور مسلمان اس کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔

۲۔ وہ مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچاتے۔ کسی عورت کے ساتھ زنا نہ کرے، مسلمانوں کا مال چوری نہ کرے اور مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز نہ کرے۔

۳۔ جن کاموں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے ان کا علی الاعلان ارتکاب نہ کرے، جیسے شراب نوشی، زنا اور ان عورتوں سے نکاح جن سے اسلام میں نکاح جائز نہیں۔

۴۔ غیر مسلم نئے کلیسا اور کنیسا تعمیر نہ کریں، ناقوس نہ بجائیں اور اس بارے میں عام قوانین پر عمل کریں۔ (اسی ذیل میں گرجا گھروں، مسجدوں اور مکانات سے متعلق بحث کی گئی ہے اور

ان سے متعلقہ احکام بیان کیے گئے ہیں، بہر حال غیر مسلم
 نئی عبادت گا ہیں تعمیر نہیں کر سکتے۔ اگر وہ کوئی ایسی عمارت
 تعمیر کریں گے تو گرا دی جائے گی۔ ان مقامات پر جہاں مسلمانوں
 کی اذان بلند ہوتی ہے، ناقوس کی آواز بلند نہیں ہونی چاہیے
 ۵۔ وَلَا يُعَلِّي الدِّمِيَّ بُنْيَانَهُ فَوْقَ الْمُسْلِمِ۔ کس ذمّی کو
 یہ حق نہیں کہ وہ مسلمانوں کی عمارتوں سے بلند تر کوئی
 عمارت تعمیر کرے۔

ہماری شاہلہوں پر یہ کئی منزلہ عمارتیں کس کی ہیں؟ وہ کون
 ہیں جو اس مملکت میں مسلمانوں کے دشمنوں سے تعاون کر رہے ہیں جبکہ
 اسلام کا قانون موجود ہے؟ کیا یہ اسلامی فقہ ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ آپ
 لوگ خود اعتراف کریں، کون لوگ مسلمانوں کے اموال غصب کر رہے ہیں
 اور صہیونزم اور دنیا بھر کے یہودیوں کی مدد کرتے ہیں؟ وہ کون ہیں جو
 مسلمان عورتوں کی بے عصمتی کا سبب بنتے ہیں؟ کیا یہ ذمّی ہیں یا
 مجّارب؟ اس کے متعلق کوئی فقہیہ ہی فتویٰ دے سکتا ہے۔

علمائے اہل سنت اور علمائے شیعہ نے اس بارے میں جو احکام
 بیان کیے ہیں، ان کے مطابق اگر کوئی حکومت (ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ہمارا
 ملک میں یہ صورت نہیں) خود ان معاملات میں ملوث ہو تو مسلمانوں کی کیا
 ذمّہ داری ہے؟ اس حکومت کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟
 اسلامی فقہ کا حکم کیا ہے؟ میں یہ نہیں چاہتا کہ اس حکم کو بیان کرنے میں کسی
 تعصّب سے کام لیا جائے۔

ایک طرف وہ مسلمانوں کو صحراؤں میں دھکیل دیتے ہیں اور اسلامی

حدود کو پامال کرتے ہیں، دوسری طرف مختلف بہانوں سے مسلمانوں کی دولت پر قبضہ کرتے ہیں اور کرہے ہیں اور اسے پیداواری اور ترقیاتی کاموں پر خرچ کرنے کے بجائے بے حیائی کو رواج دینے میں صرف کر رہے ہیں میں کسی کا نام نہیں لیتا۔ اگر کوئی غیر ملکی حکومت اگر سفارت خانہ کھولتی ہے تو اس اسلامی ملک کے اعلیٰ احکام اور وزراء بھی وہاں جا کر کھلتے پیتے ہنستے بولتے اور عیش کرتے ہیں۔ ایسی حکومت کی نسبت مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ یہ آپ خود طے کیجیے۔

کیا ایسی حکومت کو جو اسلام کے قوانین کے تابع نہیں، مسلمانوں پر حکومت کرنے کا حق ہے؟

آپ غور فرمائیے۔ اگر جھوٹ ہو تو تردید کر دیں۔ اگر سچ ہے تو پھر یہ حالت تو اسلامی اصول سے میل نہیں کھاتی۔ آج صہیونیت استعمار ہی کی دوسری شکل ہے۔ اپنی اصلی شکل میں تو استعمار شکست کھا چکا ہے اب اس نے صہیونیت کا چولہا بدلا ہے۔ صہیونیت نے اسرائیل کی شکل اختیار کی ہے۔ ایران میں اسرائیل نے ایک اور بھیس بدل کر بہائیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔

اگرچہ ایران ایک شیعہ اسلامی ملک ہے مگر یہاں اسلام کے لیے صرف دُعا تے خیر ہی کی جاسکتی ہے، کیونکہ اس ملک کی تمام وزارتوں اور محکموں میں بہائی چھائے ہوئے ہیں۔

حکومت کے جو عہدہ دار پوشیدہ یا ظاہراً یہاں تشریف فرما ہیں میں ان کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ جناب یہ اسلام کا معاملہ ہے مذہب کا معاملہ ہے اور مذہب یہ چاہتا ہے کہ مملکت کی سربراہی خود اس کے ہاتھ

میں ہو۔ سربراہ مملکت سے اُد پر بھی وہ ہو اور نیچے بھی وہی ہو۔ اب آپ خود خیال فرمائیے کہ میں یہ باتیں کر کے آپ کو کیوں پریشان کر رہا ہوں مجھے بات نہ کرنے دیجیے۔ میری زبان بندی کر دیجیے۔ پھر میری ذمے داری ختم ہو جائے گی، لیکن جب میں یہاں آؤں گا تو مجبور ہوں گا کہ اسلامی قوانین بیان کروں۔ میں کسی کا ملازم نہیں ہوں، تنخواہ دار نہیں ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ حکومت کا انتظام میرے حوالے کر دیا جائے۔ میں کوئی خطاب نہیں چاہتا۔ میں جو کچھ بھی ہوں وہی ہوں آپ چاہیں یا نہ چاہیں۔

کل سے اب تک مجھے خوب پریشان کیا گیا ہے، محض اس لیے کہ کل شام کچھ نوجوان مسلمانوں نے دزاشیب میں ایک مجلس برپا کی تھی۔ دیکھیے یہ کیا مذاق ہے۔ مجھ سے ایک بار ہی صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ”منبر پر مت جاؤ۔ مجلس نہ پڑھو۔“

یہ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ میں پریشان ہوں، جو کچھ میں کہتا ہوں اس کی ذمے داری خود مجھ پر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کل صاحب خانہ کو بکڑ لو اس سے باز پرس کرو اور اس کی زندگی سے کھیلنے لگو، اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مجھ سے کہو کہ تم نے جھوٹ کہا، تم اسلام کے برخلاف باتیں کرتے ہو، تم تخریب کار ہو، تم نے غیر ملکی سفارت خانوں کے ساتھ ساز باز کر رکھی ہے، جو چاہو کہو، میری فرد جرم تیار کر لو۔

عوام کو معلوم ہے کہ میں کیا ہوں، اسلامی مملکت کیسی ہوتی ہے۔ کیا یہ لوگ دین پناہ کہلانے کے قابل ہیں؟ مومن اسلامی میں ہم سر اوپر نہیں اٹھا سکے جب ہمیں بتلایا گیا کہ دوسرے ملکوں سے ہمارے تعلقات کس نوعیت کے ہیں۔

جناب وزیر زراعت! کیا اس ملک میں کوئی مسلمان مشیر نہیں؟ کیا ہمارے یہاں کوئی انجینئر نہیں؟ اگر نہیں ہے تو سو سٹریٹلینڈ سے لے لو، ہندوستان سے بلالو، جرمنی سے لے آؤ، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ مشیر تقسیم اراضی کوئی یہودی صہیونی ہو؟ آخر آدمی کس کس بات کا ردنا روئے۔ میں جانتا ہوں اس لیے کہتا ہوں، میرے پاس ثبوت بھی موجود ہے۔ تم کہہ دو کہ یہ جھوٹ ہے۔ ایک ہینینہ پہلے جو جشن ہوا، مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہوا تھا، اس کے منتظین کون تھے۔ مجھے ان کے نام معلوم ہیں، میں مشیروں کو بھی جانتا ہوں۔ ہمیں اطلاع ملی تھی لیکن میں نے کہا تھا کہ ہمیں کیا، ہم سے مطلب نہیں۔ تم نے دیکھا جب کوئی کہیں سفر پر جاتا ہے یا سفر سے واپس آتا ہے تو اخباروں میں کتنا چرچا ہوتا ہے لیکن القدس کے بائیس میں کانفرنس ہوئی، کس نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا کہ اس میں کون کون شریک تھا، کیا گفتگو ہوئی۔ اس میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے سوائے اسرائیل کے کارندوں کے؟ وہی اسرائیل کے کارندے جو اس ملک میں اخلاق بھمت اور عفت، اقتصادیات، ہمت و حوصلہ ہر چیز کو برباد کرنے میں لگے ہوئے ہیں، جیسا کہ آقائے مطہری نے کہا ان کا حوصلہ ہر خطرے سے بڑھ کر ہے آج میں آپ کو، سب مسلمان بھائیوں کو، علماء کو اور آپساز گول کو اس خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ پھر آپ جانیں اور آپ کا کام یا پھر حکومت ان باتوں کی تردید کرے اور کہہ دے کہ یہ سب جھوٹ ہے، پروپیگنڈا ہے۔ ہمارا سرسرم سے تمام دنیا کے سامنے جھکا ہوا ہے۔ یہ بھی جہاد ہی کا ایک مرحلہ ہے، وہ بھی جہاد ہے جو کفار سے اسلام کی پیش رفت کے لیے ہو۔ اسلام اور اسلامی مملکت کا دفاع بھی

جہاد ہے۔ ایک جہاد اس کے لیے ہوتا ہے کہ ذمی، محارب نہ بن جائے۔
جہاد کی تین قسمیں ہیں جن کا اسلام نے حکم دیا ہے۔

وہ جنگ جو استبداد اور آمریت کے خلاف لڑی جائے وہ بھی جہاد ہے تاکہ کوئی اسلامی ملک میں من مانی نہ کر سکے، طاعت نہ بن جائے۔

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ مستبد اور آمر کی اصلاح کرے، اسے نیک صلاح دے۔ خود آمریت اور استبداد کوئی اچھی چیز نہیں، ملک کے مفاد میں نہیں، معاشرے کے مفاد میں نہیں۔ کوئی آمر ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس کو نصیحت کرنی چاہیے۔ اگر نصیحت پر کان نہ دھرے تو پھر اس کے مقابلے میں محاذ آرائی اور طاقت کا استعمال ضروری ہے۔

ممکن ہے آپ لوگ جو مسلمان ہیں یہ کہیں کہ اگر یہ بات ہے تو علمائے اسلام کیوں جہاد کے بارے میں یہ باتیں نہیں کرتے؟ ہماری روایات اور احادیث میں اس سے مختلف بیان کیوں ہے؟

جب ہم اسلام کی ابتدائی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ صدرِ اول میں امیر المومنینؑ نے ان سب جنگوں کو جن میں مسلمانوں نے شرکت کی درست قرار دیا، نہ صرف جہاد میں مدد دی بلکہ بعض جنگوں میں خود اپنے بیٹوں کو بھیجا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کے بعد معاویہ اور یزید کا دور آگیا۔

جہاد کے بارے میں جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان میں جہاد کی شرط یہ ہے کہ امام عادل یا سلطان عادل کی قیادت میں جہاد کیا جائے۔ اخبار و احادیث میں یہ تصریح ہے کہ جنگ سلطانِ جائز یا امامِ جائز کے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے نہ ہو، اسی لیے حکم ہے کہ سلطانِ عادل کی

قیادت میں جنگ اور دفاع کرو۔

ائمہ کے زمانے میں حالات کیا تھے؟ مسلمان لڑتے تھے، اسلامی علاقے میں وسعت پیدا ہوتی تھی لیکن اس سے فائدہ کسے پہنچاتا تھا؟ اگر کوئی مسلمان جا کر چین کو فتح کر لے اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ عبدالملک بن مروان، سلیمان بن عبدالملک یا کسی عباسی خلیفہ کو اس کا فائدہ پہنچے اور وہ امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسائین بن جائے تو اسلام یہ نہیں چاہتا۔ اسی وجہ سے روایات میں سلطان عادل پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ یہ ہے اصل بات جس طرح روایات میں نماز جمعہ کے متعلق آیا ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

نماز جمعہ حکومت کا نشان ہے۔ اگر یہ کہہ دیا جاتا کہ جو بھی ہو اس کے ساتھ نماز جمعہ پڑھنا صحیح ہے تو اس کا مطلب ولید بن عبدالملک کی حکومت کو صحیح قرار دینا تھا، متوکل عباسی کی حکومت کو صحیح قرار دینا تھا، کسی اموی بچے کی حکومت کو صحیح قرار دینا تھا کیونکہ جمعہ کی نماز کے امام ان ہی کے ہاتھ ہوتے تھے۔ جمعہ کی نماز دوسری نمازوں کی طرح کی نماز نہیں ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ اگر تم کو امام عادل ملے تو جمعہ کی نماز پڑھو ورنہ نہ پڑھو۔ کسی چاہر حکومت کی تائید اور توثیق مت کرو۔ لیکن اگر مسلمان خود جمع ہو کر نماز پڑھیں اور یہ مانع موجود نہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ نماز جمعہ واجب نہ ہو۔ جب ہم نماز جمعہ کے متعلق اخبار کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس کا معاملہ بھی جہاد کا سا ہے۔

ائمہ اہلبیتؑ فرماتے ہیں :

”آخر کس کے لیے جہاد کرتے ہو؟ اس لیے کہ ان

لوگوں کو زیادہ مال غنیمت ہاتھ لگ جائے، ہارون الرشید کے محل میں عیش و عشرت کے سامان میں اضافہ ہو جائے گا نے والیاں ایک ہزار کی جگہ پانچ ہزار ہو جائیں۔
 انہوں کو یہ اسلام منظور نہیں تھا۔ ایسا اسلام قابل قبول نہیں۔
 اس طرح کی ترقی کا اسلام کی حقیقت پر پردہ ڈالنے کے سوا کوئی نتیجہ نہیں۔
 جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوتے تو انھوں نے اصلاح کی کوشش کی اور جب چاہا کہ لٹیروں کو روک لگائیں تو ہر طرف سے مخالفت شروع ہو گئی۔ اس وقت شاید ترکستان کے والی نے لکھا تھا کہ لوگ جو قہر جو قہر آرہے ہیں کہ ہم ان کا اسلام قبول کر لیں تاکہ انھیں خراج یا جزیہ نہ دینا پڑے۔ اجازت دیجیے کہ ہم ان کا اسلام قبول نہ کریں تاکہ ان سے جزیہ لیتے رہیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے ایک نمائندے کو اس ہدایت کے ساتھ بھیجا کہ وہاں جا کر اُس والی کو کوڑے لگائے اور اسے لکھا کہ

إِنَّ اللَّهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ
 هَادِيًا وَمَا بَعَثَهُ جَابِيًا.

خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو ہادی بنا کر بھیجا تھا محضیل خراج نہیں۔

مصر سے لکھا گیا کہ قبطلیٰ ہر مسلمان ہو رہے ہیں، اجازت دیجیے کہ ان کا تختہ کر دیا جائے۔ جو تختہ کر لیں ان کا اسلام ہم قبول کریں اور جو تختہ پر رضامند نہ ہوں ان سے خراج لیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے اس موقع پر بھی اپنا نمائندہ بھیجا اور لکھا :

إِنَّ اللَّهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا خَاتِمًا وَمَا بَعَثَهُ خَاتِنًا.

”خداوند تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کو خاتم الانبیاء بنا کر بھیجا تھا
اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ لوگوں کا حُسنہ کیا کریں“

غرض فتوحاتِ اسلامی نے یہ صورت اختیار کر لی تھی۔ آخر نوبت
یہاں تک پہنچی کہ ایک اسلامی ملک دوسرے اسلامی ملک پر حملہ کرنے
لگا اور مقصد یہ ہوتا تھا کہ دوسرے ملک کی دولت پر قبضہ کر کے اسے ہڑپ
کر لیں۔ اس لیے ائمہ طاہرینؑ نے فرمایا کہ

”جہاد صرف اُس وقت جائز ہے جب امام عادل

یا سلطانِ عادل موجود ہو“

جیسا کہ بعض فقہاء نے کہا کہ امام عادل سے مراد امامِ معصوم ہے اگر
ایسا ہوتا تو عادل کا لفظ استعمال نہ کیا جاتا۔ عدالت اور عصمت میں عموم و خصوص
مطلق کی نسبت ہے یعنی ہر معصوم عادل ہوتا ہے لیکن ہر عادل معصوم
نہیں ہوتا۔ لہذا اگر مسلمانوں کی قیادت کسی عادل کے ہاتھ میں ہے تو
اس صورت میں جہاد سب پر واجب ہے۔

جہاد ایسا موضوع ہے کہ میری رائے میں بزرگ علماء، فضلاء اور

خطیب حضرات اس پر مزید گفتگو اور تحقیق کریں۔

ایک ایسا مذہب جو برحق ہے اور جس کا اپنا نظام ہے، یہ ممکن
نہیں کہ اس میں جہاد اور دفاع نہ ہو۔ اور چاہے کوئی کچھ بھی کر گڑھے یا
اسلام اور مسلمانوں پر کیسی ہی آفت کیوں نہ آئے مسلمان خاموش بیٹھے
رہیں اور اسلام کی پیش قدمی کی قوت کو ضائع کر دیں، اسلام کو بالکل
بے رُوح اور بے دست و پا کر دیں۔

مجھے ایک روایت یاد آئی ہے جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں:

حضرت امام سجادؑ کے لیے جارہے تھے کہ ایک شخص عبادی بصری
 جس کا کام نکتہ چینی اور الزام تراشی تھا، حضرت کے پاس آیا اور کہنے لگا:
 تَرَكْتُ الْجِهَادَ وَصُعُوبَتَهُ وَأَقْبَلْتُ عَلَى الْحِجِّ
 وَلَيْبِنِهِ .

آپ نے جہاد کا مشکل کام تو چھوڑ دیا اور حج کا
 آسان کام اختیار کر لیا۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ
 وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ . يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ
 اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ . وَعَدَاً عَلَيْهِ حَقًّا فِي
 التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ . وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ
 مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بَبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ
 بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ .

”اللہ نے مومنین سے ان کی جان اور مال خرید لیے
 ہیں جنت کے بدلے میں۔ یہ جہاد کرتے ہیں اللہ کی راہ
 میں سوتل بھی کرتے ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں۔ یہ
 اللہ کا سچا وعدہ ہے تورات میں، انجیل میں، قرآن میں۔
 اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہے؟
 پس خوش ہو جاؤ کہ تم نے کتنا اچھا سودا کیا ہے۔ یہی
 دراصل عظیم کامیابی ہے۔ (سورہ توبہ۔ آیت ۱۱۱)

حضرت نے کمال متانت سے جو آپ ہی کا حصہ تھا فرمایا:

عباد! بات یہاں ختم نہیں ہوئی، اگلی آیت بھی پڑھو۔ اس نے آگے پڑھا:

التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّاعُونَ
الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْأَمْرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ
اللَّهِ. وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ.

توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد و ثنا کرنے والے، راہِ خلا میں سفر کرنے والے، رُکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک کاموں کا حکم دینے والے، بُرائی سے روکنے والے اور حُدودِ الہی کی حفاظت کرنے والے۔
خوشخبری دے دیجیے مومنوں کو۔ (سورۃ توبہ - آیت ۱۱۲)

اس آیت کی بنا پر جہاد کی شرط یہ ہے کہ مردِ مجاہد گناہوں سے تائب ہو، عبادت گزار ہو، وطن سے باہر نکلے، راکع و ساجد ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہو اور حُدودِ اللہ کا پاس کرتا ہو۔
حضرت نے اس شخص سے کہا کہ تم نے ان اوصاف کے حامل لوگ کہیں دیکھے ہیں، ایسے لوگوں کی ہمراہی میں جہاد حج سے افضل ہے۔
یعنی کس مقصد کے لیے اور کس کی ہمراہی میں کا سوال ہے۔
ائمہ اہل ہدایت کے زمانے میں اس طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔

جہاد کے بارے میں ائمہ کے طرزِ استدلال پر غور کرنا اور جو الفاظ انہوں نے استعمال کیے ہیں ان کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ کیا ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے دفاع کی قوت اور ترقی کا جذبہ ختم

ہوجاتے ہمسلمان كاسہ لیس بن جائیں ، ذلیل ہوجائیں ، بے بس اور كمزور ہوجائیں یا یہ مقصد تھا كہ مسلمان بلاوجہ اپنے آپ كوںہ كٹوائیں؟ جب حق واضح ہو ، یہ معلوم ہو كہ مد مقابل كون ہے ، جہاد كا نتیجہ کیا ہوگا ، نیتیں صاف ہوں ، جہاد فی سبیل اللہ ہو ، تب مسلمانوں كو اٹھنا چاہیے ، ورنہ اسلام نے جتنی اہمیت جہاد اور قتال كو دی ہے اس سے زیادہ وہ انسانی جانوں كو قیمتی سمجھتا ہے۔ یہ نہیں كہ لوگ جذبات کی رو میں بہہ كراے جائیں یا جوش میں آكر كسی خاص گروہ كے مفاد كے لیے قربانی كا بكارا بن جائیں۔

جب لوگوں سے کہا جائے گا كہ قوم کی حفاظت اور بقا كے لیے یا قوم کی عزت كے لیے مملكت كا دفاع كرو تو ایک مسلمان لائحہ الہ پوچھے گا : كس كے لیے ؟ كون سی مملكت ! کیا میں دیوانہ ہو گیا ہوں كہ مملكت كا دفاع اس لیے كروں كہ چند لوگوں كا تسلط اور مضبوط ہوجائے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ لوٹ مچاسکیں۔ ہاں اگر یہ کہا جائے كہ حق کی حمایت کی خاطر خدا کی راہ میں آگے بڑھو تو میں حاضر ہوں ، سینہ سپر ہوں۔

اگر كسی سچے مسلمان سے یہ کہا جائے كہ فلاں ماڈی مشك كے لیے لڑو گے جو كھانے اور كپڑے کی ضمانت دیتا ہے تو ظاہر ہے كہ اس كا جواب یہ ہوگا كہ یہ لوگ دنیا كے دیوانے ہیں۔ وہ عاقل لوگ جو ان چیزوں سے بالاتر ہیں اور اسلامی تعلیمات كے پابند ہیں ، ان كا جہاد حق كے لیے اور فی سبیل اللہ ہوتا ہے۔ اسلام نے اس كے لیے سدا قائم رہنے والی راہیں استوار كر دی ہیں۔

یہ چند مجید سید الشہداءؑ کے اس خطبے کے ہیں جو آپ نے کربلا کے قریب پہنچنے کے بعد ارشاد فرمائے تھے۔ ابو مخنف طبری، عقبہ بن ابی العیزرات سے نقل کرتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ تبر بعض لوگوں کو ہضم بھی ہو سکے گی یا نہیں۔ بہر حال، منزل بیئٹہ میں جب حُر کے سپاہی بھی امام عالی مقامؑ کے پاس موجود تھے، آپ نے کھڑے ہو کر یہ چند فقرے کہے، تاکہ آپ کا مقصد سب پر واضح ہو جائے، یہ ایک اصول بات ہے۔ آپ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

إِنَّهَا النَّاسُ إِنْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَإِلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:
اللہ کا طریقہ یہ تھا کہ جب وہ کوئی بات خاص اپنے شیعہ اور اپنے پیروکاروں اور معتقدین سے کہتے تھے تو خود اپنی طرف سے بیان کرتے تھے لیکن اگر مخاطب ایسے لوگ ہوتے جو عقیدت مند نہیں یا شک اور شبہ میں مبتلا ہوتے تھے تو وہ رسول اکرمؐ کی حدیث نقل کرتے تھے۔
فرمایا: رسول خداؐ نے فرمایا ہے کہ

”جس شخص نے کسی جابر سلطان کو دیکھا کہ وہ ان باتوں کو جو اللہ نے حرام کی ہیں حلال ٹھہراتا ہے، اللہ کے عہد کو توڑتا ہے، سنت رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے، خدا کے بندوں پر ظلم کرتا ہے اور ان سے توہین آمیز

لے ہر دو صورت میں کلام رسول اکرمؐ کا ہوتا تھا۔

برتاؤ کرتا ہے، اگر اس شخص نے اس کے رویہ کو اپنے قول یا عمل سے بدلنے کی کوشش نہ کی (یعنی خاموشی اختیار کی) (كَانَ حَقًّا عَلَى اللَّهِ أَنْ يُدْخِلَهُ مَدْخَلَهُ تَوَالِدًا) کو حق ہے کہ جہنم کے جس درجے میں چاہے، اس ظالم کو داخل کر دے اور اس سکوت کرنے والے شخص کو بھی اس ظالم کے ساتھ جہنم میں داخل کرے کیونکہ اپنے سکوت کی وجہ سے یہ بھی اس کے ظلم میں اور اس کے جرم میں شریک ہے۔“ (یہ رسولِ خدا کا فرمان ہے)۔

پھر فرمایا:

”دیکھو اور آگاہ رہو کہ ان لوگوں نے یعنی حکومت اور اس کے کارندوں نے شیطان کی فرمانبرداری اختیار کر رکھی ہے اور رحمن کی اطاعت چھوڑ دی ہے، بد اعمالی کو علانیہ پھیلا رہے ہیں، حدود کو معطل کر دیا ہے، عوام کے مال پر قبضہ جمالیایا ہے، جن کاموں کو اللہ نے حرام کیا ہے وہ انھوں نے حلال کر دیے اور جن کاموں کو اللہ نے حلال کیا ہے وہ انھوں نے حرام کر دیے۔ اگر دوسرے سب مسلمان اس پر خاموش رہیں تو سب سے بڑھ کر یہ میرا فرض ہے کہ میں اس صورت حال کو بدلوں۔“

پھر آپ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

”تم نے مجھے خطوط لکھے، پیغام بھیجے، تمہارے نائب میرے پاس آئے اور انھوں نے کہا کہ تم نے یہ عہد کیا ہے

کہ تم میری مدد کرو گے، میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ اب اگر تم اپنے عہد اور اپنی بیعت پر قائم رہتے ہو تو یہ عقل کی بات ہوگی کیونکہ میں حسینؑ، فرزند علیؑ اور فرزند فاطمہؑ بنت رسول اللہ ہوں۔ نَفْسِي مَعَ أَنْفُسِكُمْ. أَهْلِي مَعَ أَهْلِيكُمْ میں خود تمہارے ساتھ ہوں اور میرے اہل خاندان تمہارے اہل خاندان کے ساتھ ہیں۔ ہم اپنے آپ کو تم سے جدا نہیں سمجھتے اور نہ کسی امتیاز کے خواہاں ہیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ ہیں جو لوگوں پر گزرے گی وہی ہم پر گزرے گی اور جو ہم پر گزرے گی وہی لوگوں پر۔ ہماری جان لوگوں کی جان کے ساتھ ہے۔ ہم لوگوں پر حکومت کرنا اور ان سے ممتاز ہونا نہیں چاہتے۔ ہم اپنے آپ کو تم ہی میں سے ایک فرد سمجھتے ہیں۔ ہمارے بیوی بچے تمہارے بیوی بچوں ہی کے مثل ہیں۔ (تاریخ خطبری جلد چہارم)

آپ نے یہ کوئی ایسی بات نہیں کہی جس پر کسی کو حیرت ہوتی ہو کیونکہ امام علیؑ کی چند سالہ حکومت کا نمونہ سب کے سامنے تھا، جو کوئی امام علیؑ کو کوچہ و بازار میں دیکھتا تھا، کیا وہ ان میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق محسوس کرتا تھا؟ جو شخص ان کے گھر جاتا تھا کیا وہ ان کا گھر اور سامان دوسروں سے ممتاز پاتا تھا؟ کیا ان کے بیوی بچے دوسروں سے ممتاز تھے؟ یہ ہے ایک اعلیٰ نمونہ اسلامی حکومت اور اسلامی حاکم کا۔ یہ حکومت کسی فرد کی نہیں، خدا کی حکومت ہے۔ بنیادی طور پر اسلام میں غیر اللہ کی حکومت ہے ہی نہیں، حکومت صرف خدا کی ہے اِنَّ الْحُكْمَ لِلّٰهِ

پیغمبرؐ، امامؑ اور ان کے بعد مجتہد، حتیٰ کہ عام مسلمان محض قوانین الہی کو نافذ کرنے والے ہیں، اس لیے آپ نے فرمایا: **نَفْسِي مَعَ الْفَسِيكُمْ وَ أَهْلِي مَعَ أَهْلِيكُمْ**۔ یہ بت سمجھو کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری اور میرے گھر والوں کی جان محفوظ رہے اور میں دوسروں کو کٹوا دوں۔

علیؑ اور معاویہ میں ظاہری فرق یہی تھا۔ معاویہ محاذ سے پیچھے تکیہ لگاتے بیٹھے رہتے تھے، ان کے قدموں کے نیچے نرم تو شاک کچھی رہتی تھی۔ ایک طرف گاؤ تکیہ ہوتا تھا، سامنے ہر قسم کی مٹھائیاں چبی ہوتی تھیں، مٹھائی کھاتے تھے اور ہنستے تھے، جن کی قسمت خراب تھی ان کو تلوار کا سامنا کرنے کے لیے بھیج دیتے تھے۔ وہ حکم دیا کرتے تھے: ”جاؤ اور قتل ہو جاؤ۔“

علیؑ بھی فرمان صادر کرتے تھے مگر وہ محاذ جنگ پر خود سب سے آگے رہتے تھے، وہ تلواروں اور جگر روز تیروں کا بنفس نفیس سامنا کرتے تھے، لوگوں کو نصیحت کرتے تھے، ان کی رہنمائی کرتے تھے اور نعرے لگاتے تھے جب ہم میدانِ صفین کا تصور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے کہ معاویہ اپنی نشست گاہ پر بیٹھے ہوتے لوگوں کا مذاق اڑا رہے ہیں، خوش ہیں کہیں نے ان کو خوب خوب بیوقوف بنایا۔ غلط پروپیگنڈا کر کے سادہ لوح لوگوں کے جذبات کو ابھار کر مرنے کے لیے محاذ پر بھیج رہا ہوں تاکہ خود آرام سے حکومت کروں۔ علیؑ جب کوئی حکم دیتے تھے پہلے خود آگے بڑھتے تھے یہ بے نمونہ **نَفْسِي مَعَ الْفَسِيكُمْ وَ أَهْلِي مَعَ أَهْلِيكُمْ** کا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ:

”اگر تم نے بیعت توڑ دی ہے، اگر تم اب پشیمان ہو

اور اپنے عہد سے پھر گئے ہو تو یہ بھی تم سے کچھ بعینہ نہیں۔
 تم نے میرے والد، میرے بھائی اور میرے چچا کے بیٹے
 مسلم کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا۔ جو تم پر بھروسہ کرے
 وہ دھوکا کھائے گا۔ اگر تم اپنا عہد نہیں نبھاتے تو کچھ
 ہمارا ہی نقصان نہیں کرو گے بلکہ خود بھی گھاٹے میں
 رہو گے۔ فَمَنْ تَكْتَفِ فَاِتْمَا يَنْكُثْ عَلٰى نَفْسِهٖ۔
 جو اپنے عہد سے پھرتا ہے وہ خود اپنا ہی نقصان کرتا
 ہے۔ خدا جلد مجھے تم سے بے نیاز کر دے گا۔ فَسَيُعْزِى
 اللّٰهُ مِنْكُمْ جَب مَجْهٖ لٰپِنٖ جَوَارِ رَحْمَتِ مِیْنِ جَلْهٖ لٰی كَا۔

بھکارا انوار میں مناقب ابن شہر آشوب سے منقول ہے کہ جب
 حُر بن یزید ریاحی نے عبید اللہ بن زیاد کے حکم سے سمرقند میں گریلا میں آپ
 کو سواری سے اتار دیا اور ہزار سواروں کے لشکر کے ساتھ آپ کے مقابل
 آتا تو آپ نے قلم اور کاغذ منگایا اور کوفہ کے اشراف اور شیعہ بزرگوں
 کو اس مضمون کا خط لکھا:

”منجانب حسین بن علی بنام سلیمان بن صرد،
 مسیب بن نجیب، رفاعہ بن شداد، عبید اللہ بن وال اور
 دوسرے مومنین“

جن شیعہ سربراہوں کے نام آپ نے خطوط لکھے تھے، وہ یا
 تو قید خانے میں تھے یا شہر بدر کر دیے گئے تھے یا کسی اور عذر کی بنا پر آپ
 تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ خط کی عبارت ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے:
 ”وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ تَحِیْنِ مَعْلُومِہٖ اَنَّ رَسُولَ

اللّٰهُ قَالَ مَنْ رَأَىٰ سُلْطٰنًا جَابِرًا لَمْ
شاید تقریر کے وہی فقرے لکھ کر کو فر کے ان لوگوں کو بھیجے تھے۔



اس بحث کا تہتمہ شہید کے بارے میں گفتگو سے متعلق ہے۔
شہادت کی شرائط اور اس کے آثار پر بھی فقہ میں مفصل بحث کی
گئی ہے، جس شخص نے اس کی حقیقت اور اس کے مقصد کو سمجھ لیا اور
پھر اس پر ثابت قدم رہ کر جان دی وہ قرآن کی اصطلاح میں ”شہید“ ہے۔
یعنی وہ شخص جس نے حق کا مشاہدہ کیا ہو، اس کا مارا جانا محض کسی کی
عَلَطی، اِسْتِغَال اور جذبات کے بھڑک اُٹھنے کا نتیجہ نہ ہو بلکہ حق اور
ہَدَف کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس نے اپنی جان قربان کی ہو، ایسا شخص
کسی لالچ یا شخصی منفعت کی تمنا میں نہیں بلکہ قربت کے قصد سے جان
دیتا ہے، وہ ذاتی تمناؤں اور آرزوؤں سے بالاتر ہوتا ہے، وہ حق کی
قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہوتا ہے، اسی وجہ سے حق کے لیے اپنے
آپ کو فنا کر دیتا ہے۔ یہی فنا کی حقیقت ہے — فنا یہ نہیں کہ صوفی
خانقاہ میں بیٹھا اللہ کو کرتا رہے اور سمجھ لے کہ میں واصلِ نجات ہو گیا،
واصلِ نجات ہونے کے معنی یہ ہیں۔

از پائی تا سرت ہمہ نورِ خدا شود
گر در رہِ خدای تو بے پا و سر شوی

شہید اسی کا نام ہے جو حق کے لیے مریٹے، راہِ حق میں اپنے
آپ کو بالکل فراموش کر دے، حق کا مشاہدہ کر کے حق کو قائم کرنے کی خاطر
جان دینا گوارا کرے۔

ہر مقتول شہید نہیں ہے۔ جو شخص کسی غلطی کی بنا پر یا کسی ایسے کام کے لیے مارا جاتے جس میں دُنیا داری کا پہلو ہو تو وہ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ کا مصداق ہے۔

شہید وہ ہے جو دین کمائے، خُدا کو پہچانے، جس کا آخرت پر اعتقاد ہو، بقا پر اعتقاد ہو، ہَدَف اور مقصد کو اچھی طرح سمجھ کر دُنوی تعلقات سے منہ موڑ لے۔ چونکہ ایسا شخص حق کا مشاہدہ کرتا ہے اس لیے وہ مرنے سے نہیں ڈرتا، مَوْتِ اس کے لیے آسان ہے۔

بعض صُوفیاء کہتے ہیں کہ نماز میں قطب کی طرف توجہ کرنی چاہیے انسان چونکہ ماڈی ہے وہ خدائے مُطلق کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا اس لیے خدایک طرف توجہ کے لیے کسی ماڈی مَظہر کا سہارا لینا چاہیے۔ "یہ صُوفیاء کی غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بتدریج ماڈی حدود سے نکل کر ہی مُطلق کی طرف توجہ ممکن ہے۔

البتہ ضمناً ہم ایک خاص گروہ کی طرف اشارہ کرتے چلیں کہ ہم نماز میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِينُ. اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کے بعد ہمیشہ یہ کہتے ہیں صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی اے اللہ ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا آج کو تو نے اپنی نعمتیں دی ہیں۔ "کون سی نعمتیں؟ کیا مال و دولت اور طاقت اور قُدْرَت؟ ایک دوسری آیت میں ہے:

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ

اَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ

جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ

ہوں گے جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔

آگے ان انعام یافتہ گروہوں کی تفصیل ہے :
 پہلے السَّبِيَّةِ -

دوسرے درجہ میں الصِّدِّيقِيْنَ یعنی جنھوں نے اپنے دل و دماغ سے حق کا مشاہدہ کر کے اس کی جان و مال سے تصدیق کی۔

وَالشُّهَدَاءِ یعنی جو راہِ حق میں شہید ہوئے۔ ان کا درجہ بہت بلند ہے۔

وَالصَّالِحِيْنَ وہ جو پہلے تین گروہوں کے بعد آتے ہیں اور اپنی زندگی میں ان کا اتباع کرتے ہیں “
 (سورۃ نساء - آیت ۶۹)

یہ چار گروہ ہیں جن کو اللہ نے اپنی تمام نعمتوں سے نوازا ہے، چنانچہ جو لوگ اللہ کی اطاعت کرتے ہیں وہ بھی ان کے ساتھ اور ان ہی کے ہمقدم ہیں۔

شہداء میں چونکہ ایک باطنی انقلاب ظہور پذیر ہوتا ہے، وہ حق کا مشاہدہ کرتے ہیں اور راہِ حق میں لکے جاتے ہیں، اس لیے اللہ نے بھی ضمانت دی ہے کہ وہ ان کے وجود کو باقی رکھے گا۔ کیا آپ کو اس پر حیرت نہیں کہ کچھ لوگ دُنیا کے ایک گوشے میں جمع ہوتے، دشمنوں نے ان کی آواز بھی باہر نہیں نکلنے دی بلکہ ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا، ان کا محاصرہ کر لیا، ان کو قتل کر دیا، ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، ان میں سے کسی کو بھی باقی نہیں چھوڑا کہ دوسرے مقامات پر جا کر لوگوں کو خبر کر دے کہ قصہ کیا تھا، اس کے باوجود مخلوقِ خدا نے ان کے نام، ان کے کام اور ان کے

اسٹار کو باقی رکھا۔ کیا یہ معجزہ نہیں ہے، کیا یہ حق کا ظہور نہیں کہ ہم دیکھ لے رہے ہیں کہ دنیا میں ان کی تاریخ اتنی تفصیل سے باقی اور زندہ ہے؟ ان کے والدین کے نام، ان کی بیویوں کے نام، حتیٰ کہ ان کے گھوڑوں کے نام، نیز وہ الفاظ جو انھوں نے میدان جنگ میں کہے تھے، سب زندہ و پابندہ ہیں۔

یہ تفصیل کہاں سے آتی اور کیوں کر باقی رہ گئی، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فنا کے درجہ سے گزر کر بقا کی منزل کی طرف آگئے تھے۔ ارتقار اور روحانی سیر کی بنیاد یہی ہے۔ سبزہ بھیڑ کے پیٹ میں جا کر گوشت پوست اور ہڈیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے اور بھیڑ کا گوشت آدمی کے پیٹ میں جا کر فکر و ادراک اور طاقت اور ایمان میں بدل جاتا ہے۔ اگر کسی عالی قدر انسان کے پیٹ میں جاتا ہے تو ارادے، طاقت اور ایمان اور ایسی ہی دوسری صلاحیتوں میں بدلتا ہے جو جاوداں ہیں۔ معلوم ہوا قربانی ارتقار کی ایک منزل ہے۔

از جمادی مُردم و نامی شدم

پس چہ ترسم کی ز مردن کم شدم

روحی کہتے ہیں: جمادات کی حیثیت سے فنا ہونے کے بعد ہی مجھ میں نمود کی صلاحیت پیدا ہوتی، پھر میں کیوں ڈروں کہ مرکز فنا ہو جاؤں گا۔

جو آدمی اپنے آپ کو ایک ارفع حقیقت کے لیے قربان کرتا ہے

وہ ضرور باقی رہتا ہے، پس چہ ترسم کی ز مردن کم شدم، بلکہ

بار دیگر تا بمیرم از بشر

پس برآرم با ملائک بال و پر

”اگر میں ایک دفعہ اور بحیثیت انسان کے مراہوں تو پھر ممکن ہے کہ میں عالم ملکوت تک پہنچ جاؤں اور فرشتوں کے سے بال و پر پیدا کر لوں“

ان لوگوں نے روزِ عاشوراء بال و پر پیدا کر لیے تھے، گویا ان کی شخصیت مستحکم ہو گئی تھی۔ ایک نے کہا: ”ابو عبد اللہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں میدان میں جاؤں“۔ دوسرے نے کہا: ”مجھے اجازت دیجیے کہ میں جان پر کھیں جاؤں وَلَقَدْ ضَاقَ صَدْرِي مِنَ الْحَيَاةِ مُجْهَابٍ“ مزید جینے کی تمنا نہیں ہے۔“ وہ اس طرح کے لوگ تھے، ان کے بھی بیوی بچے تھے، عزیز رشتہ دار تھے، ان کی بھی اپنی ضروریات تھیں۔

زہرہ بن قتیب بجلی کو لیجیے! دودن پہلے تک وہ خونِ عثمان کے بدلے کا مطالبہ کر رہے تھے، معاویہ اور ان کی حکومت کے پروپیگنڈے سے متاثر تھے، آلِ علیؑ کو کسی اور ہی نگاہ سے دیکھتے تھے، اتفاقاً راستے میں ملاقات ہو گئی، حسینؑ بن علیؑ کے خیمے میں گئے۔ معلوم نہیں کیا بات ہوئی، معلوم نہیں ان میں حسینؑ بن علیؑ نے کون سی بجلی کی لہر دوڑادی کہ سب دنیاوی تعلقات کو جلا کر خاک کر دیا۔ تھوڑی دیر پہلے زہرہ کے مالِ موسیٰ ان کے پاس تھے، جن میں اونٹ، بھیر بکریاں اور گائیں تھیں، ان کا قبیلہ تھا، وہ مالدار تھے، اب ان سب چیزوں سے ایک دم دست بردار ہو گئے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ”میں نے دیکھا کہ میری شکل تک بدل گئی۔“ آخر ہم لوگ اتنے مُردہ دل کیوں ہیں۔ یہی نہ کہ ہمارا کوئی ہدف نہیں، چونکہ کوئی ہدف نہیں اس لیے سمجھتے ہیں جو کچھ ہے دولت اور طاقت ہی ہے، چاہے جس طرح بھی ہاتھ آئے، اگر یہ میسر نہیں تو زندگی تلخ ہے۔ تابو ہو، صنّاع ہو یا

حکومت کا کوئی عہدہ دار، شام کو جب گھر لوٹتا ہے تو اس قدر تھکا تھکا سا اور منہ بناتے ہوئے ہوتا ہے کہ اس کے بوی بچوں کو بھی اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی کیونکہ اس کو وہ سب کچھ نہیں مل سکا جو وہ چاہتا تھا۔ وہ کیا چاہتا تھا؟ فوجی ہو یا سول ملازم، ہر ایک یہی کہتا ہے کہ آج یا اس سال میرے سب ساتھیوں کی ترقی ہوگئی میری نہیں ہوئی، سب کا درجہ بڑھ گیا، میرا نہیں بڑھا۔ فلاں شخص کی آمدنی کہاں سے کہاں پہنچ گئی میری وہی حالت ہے۔ مالی حالت خراب ہے، یہ سب افسردہ ہیں، الکساٹ چھائی ہوئی ہے، دل بگھے ہوئے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ دنیا کے بندے بنے ہوئے ہیں۔ آئیے شہید بنیں تاکہ دنیا پر غالب آجائیں۔ مومن کے یہی معنی ہیں۔

یہی ڈیپٹر، جب امام حسینؑ کے پاس گئے تھے تو افسردہ خاطر تھے، تذبذب میں مبتلا تھے، وہ نہیں جانتے تھے کہ زندگی کے کیا معنی ہیں اور علیؑ حق پر ہیں یا معاویہ؟ انھیں طرح طرح کے وسوسے ستاتے تھے، وہ تذبذب کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے، حسرتیں، آرزوئیں پیسے ڈالتیں تھیں، مکروہاتِ زمانہ سے دم لینے کی فرصت نہیں تھی لیکن جب وہ واپس آئے، ان میں زندگی کی نہی لہر ڈور رہی تھی، سب شہادتِ رفیع ہو چکے تھے انھوں نے سب تعلقات سے منہ موڑا اور شہید ہو گئے، وہیں شہید ہو گئے، مقتول ہونے سے پیشتر ہی، اس کو کہتے ہیں شہید۔ ان کے دل کی کلی کھل گئی، زندگی آسان ہو گئی۔

اب جب کہ حق بات سمجھ میں آگئی، ان کو اور کسی بات کی پروا نہیں رہی، مارے جائیں تو مارے جائیں، زندہ رہیں تو زندہ رہیں۔ جب وہ

اپنے خیمے میں واپس پہنچے تو انھوں نے اپنی بیوی سے جن کا نام تارتخ نہیں بنت عمرو درج ہے، کہا: ”اٹھو! جاؤ اپنا کام کرو، میرا تو کام ختم ہو گیا۔ گائیں، بھیڑ بکریاں اور اونٹ سب تمھارے ہیں، میرے لیے اب ان میں کوئی کشش نہیں رہی۔“

زہیر چلتے رہے۔ اب شب عاشور ہے۔ لوضیح عاشور ہو گئی۔ عاشور کی سہ پہر آگئی۔ ان کے بدن سے خون ٹپک رہا ہے۔ ہونٹوں پر پیاس سے پڑھی جمی ہے۔ حسینؑ کے پاس آئے۔ ابو عبد اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ان کو دیکھتے ہی آنکھیں بند کر لیں۔ کیا دیکھا ہمیں نہیں معلوم کیا مطلب تھا ہم نہیں سمجھ سکتے۔ کیا زہیر دیوانے تھے؟ کیا ان لوگوں کو دیوانہ کہا جاسکتا ہے؟

زہیر نے ابو عبد اللہ کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا:
 ”فَدَّتْكَ نَفْسِي هَادِيًا مَهْدِيًا.“

”میری جان آپ پر قربان! آپ نے مجھے نجات دی۔ آپ نے مجھے آزاد کر دیا۔ دنیا کی خواہشوں سے آزاد کر دیا۔ مجھے کوئی افسوس نہیں۔“

ان کے بدن سے خون بہہ رہا ہے اور وہ کہہ رہے ہیں مجھے افسوس نہیں۔ ان کے بچے یتیم ہوا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں افسوس نہیں۔ ان کی بیوی بیوہ ہوا چاہتی ہے مگر وہ کہتے ہیں کوئی افسوس نہیں۔ اس قدر انھیں اپنے اوپر اختیار ہے۔

پھر کہتے ہیں افسوس کیوں ہو؟
 الْيَوْمَ الْفِي جَدِّكَ نَبِيًّا وَحَسَنًا وَالْمُرْتَضَى

عَلِيًّا“

آج میں آپ کے نانا رسولِ خداؐ سے ملوں گا، حسنؑ
اور علیؑ مَرْتَضَىؑ سے ملوں گا۔ اب فاصلے ختم ہو چکے ہیں
یہ میرا بدن خاک و خون میں مل رہا ہے۔

یہ تھا اعتقاد حقیقت کی بقا اور انسانیت کے راز پر۔ آپ
کے نانا کی ملاقات کو جا رہا ہوں، آپ کے بھائی اور والد سے ملاقات
کروں گا۔ اَبُو عَبْدِ اللَّهِ کے سامنے ہی گر پڑتے ہیں، قتل کر دیے جاتے ہیں۔
مشہور ہے کہ ان کی بیوی کوفہ چلی گئی تھی مگر منتظر تھی کہ زہریہ
کی کیا خبر آتی ہے۔ آخر سناؤنی آہی گئی، سب مارے گئے، حسینؑ قتل
ہو گئے، ان کے بچے قتل ہو گئے، ان کے بھائی قتل ہو گئے، ان کے ساتھ
قتل ہو گئے۔ اپنے غلام کے ہاتھ میں کفن دے کر کہتی ہے کہ ”جا کر اپنے آقا
کا کفن و دفن کر لے“ جب غلام آیا تو اسے شرم آئی۔ اس نے کفن دفن کچھ نہیں
کیا، شاید واپس چلا گیا۔ جب اس کی مالکہ نے اس سے پوچھا کہ اپنے آقا کو

لے تذکرۃ ابن جوزی میں ہے :

”جب زہریہ بن قین امام حسینؑ کی ہمراہی میں شہید ہو گئے، ان کی زوجہ نے
اپنے غلام سے کہا کہ جا کر اپنے آقا کو دفن کر دے۔ غلام آیا تو اس نے دیکھا کہ حسینؑ علیہ السلام
تن برہنہ زمین پر پڑے ہوتے ہیں۔ اس نے اپنے دل میں کہا : کیا میں اپنے آقا کو دفن
کردوں اور حسینؑ کو ایسے ہی چھوڑ دوں ؟ اس نے پہلے حضرت کو کفن پہنایا، پھر اپنے
آقا کو ایک اور کفن پہنایا“ مگر فقہاء کہتے ہیں کہ شہید کو اس کے خون آلودہ کپڑوں ہی
میں دفن کرنا چاہیے، اسے کفن کی ضرورت نہیں۔

دفن کیا کہ نہیں؟ کفن پہنایا یا نہیں؟ شاید اس نے یہ جواب دیا ہو کہ
 ”کیسے دفن کرتا؟ میں نے جا کر یہ منظر دیکھا کہ جگر
 گوشہ ہائے رسولؐ اور فرزندانِ فاطمہؑ کے جسموں کے
 ٹکڑے کر بلا کی تپتی ہوئی زمین پر خاک اور خون میں لٹھے
 پڑے ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ان جسموں کو اس حالت
 میں چھوڑ دیتا اور اپنے آقا کا کفن دفن کرتا؟“
 لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ.

الفہمہ تھامس کارلائل (۱۷۹۵-۱۸۸۱ء) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب *On Heroes, Hero-Worship, and the Heroic in History* میں یہ بات لکھی ہے۔ اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

Much has been said of Mahomet's propagating his Religion by the sword. It is no doubt far nobler what we have to boast of the Christian Religion, that it propagated itself peaceably in the way of preaching and conviction. Yet withal, if we take this as an argument of the truth or falsehood of a religion, there is a radical mistake in it. The sword indeed: but where will you get your sword! Every new opinion, at its starting, is precisely in a *minority of one*. In one man's head alone, there it dwells as yet. One man alone of the whole world believes it; there is one man against all men. That *he* take a sword, and try to propagate with that, will do little for him. You must first get your sword! On the whole, a thing will propagate itself as it can. We do not find, of the Christian Religion either, that it always disdained the sword, when once it had got one. Charlemagne's conversion of the Saxons was not by preaching. I care little about the sword: I will allow a thing to struggle for itself in this world, with any sword or tongue or implement it has, or can lay hold of. We will let it preach, and pamphleteer, and fight, and to the uttermost bestir itself, and do, beak and claws, whatsoever is in it; very sure that it will, in the long-run, conquer nothing which does not deserve to be conquered. What is better than itself, it cannot put away, but only what is worse. In this great Duel, Nature herself is umpire, and can do no wrong: the thing which is deepest rooted in Nature, what we call *truest*, that thing and not the other will be found growing at last.

۱۵۔ یہ روٹم کی اسلامی کانفرنس منعقدہ ۱۹۱۷ء کی طرف اشارہ ہے جس میں جناب طالقانی بطور ایرانی مندوب
 شریک ہوئے تھے۔ اس کانفرنس میں ان کو بتلایا گیا کہ عربی کونسل تنازعے میں پہلی حکومت نے کونسل کی حمایت کی تھی

امام حسینؑ کے قیام کے محرکات

أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قَاتَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا.
 بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ. فَرِحِينَ بِمَا
 آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ
 لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ. الْأَخَوْفُ عَلَيْهِمْ
 وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةِ اللَّهِ
 وَاللَّهُ وَفَضْلٍ وَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ.

(سورۃ آل عمران - آیات ۱۶۹ تا ۱۷۱)

میں سب سے پہلے ان محترم سامعین سے معذرت خواہ ہوں جو
 مناسب جگہ نہ مل سکنے کی وجہ سے کھڑے ہوئے ہیں یا زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں

آٹھویں شب کو ”وہ اسباب جنہوں نے امام حسینؑ کو قیام پر مجبور کیا“ کے عنوان سے کچھ مطالب عرض کیے تھے، آج ”امام حسینؑ کے قیام کا محرک“ کے عنوان سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شاید یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ آٹھویں شب کی اور آج کی تقریر کا موضوع دراصل ایک ہی ہے گو اشتہارات میں دو مختلف عنوان دیے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عنوان کی عبارت خود میری تجویز کی ہوئی نہیں ہے بلکہ میں نے تقریر کا موضوع مجل طور پر بتلادیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ جن الفاظ میں مناسب سمجھیں اس کا اعلان کر دیں چنانچہ مکتب توہید نے اپنے اشتہار میں تقریر کا عنوان وہ دیا اور انجن ہندسہ میں اس نے اپنے اشتہار میں یہ عنوان دے دیا۔ یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ

عِبَارَاتُنَا شَشِي وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَكُلُّهُ إِلَى ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيرُ

”تیرا حسن تو وہی ایک ہے، ہم اپنے اپنے الفاظ میں
اس کو بیان کرتے ہیں لیکن ہر شخص کا اشارہ اسی ایک
حسن ہی کی طرف ہے۔“

خدا کرے امت مسلمہ اپنے ہر اقدام اور ہر تحریک کے ہر مرحلے میں

اسی شعر کا مصداق ہو

عِبَارَاتُنَا شَشِي وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ وَكُلُّهُ إِلَى ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيرُ
آٹھویں کی شب میں جو مضمون میں نے بیان کیا تھا مختصراً اس کا

دہرانا ضروری ہے۔ میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ آج کے وہ سامعین جو اس
دن موجود نہیں تھے، اس نکتہ کی طرف توجہ نہ کریں جو میرے خیال میں بہت
اہم ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بعض دانشور حضرات اہل علم اور اعلیٰ پایہ

کے مصنفین پر حیرت ہے کہ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ
 ”اگر یہ پوچھا جائے کہ امام حسینؑ نے یزید بن معاویہ
 کی بیعت کیوں نہیں کی اور ایسا تند و تیز قیام کیوں کیا
 جس کے نتیجے میں وہ خود اور ان کے اصحاب شہید اور
 اہل بیتؑ اسیر ہو گئے؟

تو اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ امام حسینؑ کو یقین
 تھا کہ جس طرح سابق میں بنی سنیان کی حکومت نے ان
 کے والد امام علیؑ اور ان کے بھائی امام حسنؑ کے ساتھ
 بد عہدی کی تھی اسی طرح وہ آپ کے ساتھ بھی بد عہدی
 کریں گے۔ یعنی اگر آپ بیعت کر لیں تب بھی اور اگر آپ
 بیعت سے انکار کر دیں تب بھی وہ آپ کی جان لے کر
 رہیں گے اس لیے آپ نے با دلیٰ نحو استہ خود قتل ہو جانے
 کا فیصلہ کر لیا۔“

(مجھے اس تعبیر پر سخت شرمندگی ہے۔)

اس رات میں نے تفصیل سے عرض کیا تھا کہ اس طرح کی بات بالکل
 بے اصل، بے بنیاد اور ابو عبد اللہ علیہ السلام کی مقدس تحریک کی شان کے قطعاً
 منافی ہے۔ یہ بات جس نے بھی کہی ہو، بے اصل اور چھپ چھپسی ہے۔ اگر
 واقعی یہی بات تھی کہ حسینؑ کے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں تھی اور اگر
 وہ اطاعت قبول کر لیتے جب بھی انہیں زہر دے کر یا اور کسی طرح ہلاک

لے تفصیلات کے لیے ڈاکٹر ابیر امین کی کتاب تاریخ کاغذ اور ڈاکٹر حفصہ شہیدی کی کتاب بنا کر دلائے ہوئے کیجیے

کر دیا جاتا، اس لیے اور کوئی چارہ کار نہ پا کر انھوں نے قتل ہونا منظور کر لیا تو پھر سید الشہداءؑ کے اس عمل کی قدر و قیمت کیا رہ جاتی ہے؟ اور یہ کیوں کر ممکن ہے کہ دنیا ان کی مقدس تحریک کو تاریخ اسلام کی تمام مقدس تحریکوں کا نقطہ عروج اور تمام دینی تحریکوں کا مرکزی نقطہ مان لے خواہ وہ تحریکیں حسینؑ سے پہلے کی ہوں یا بعد کی؟ بات یہ نہیں ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، دراصل امام حسینؑ نے ۶۱ھ اور ۶۲ھ کے اداس میں اسلامی معاشرے کی حالت کے بارے میں یہ اندازہ لگایا تھا کہ مسلمانوں میں ایسا سخت بگاڑ پیدا ہو گیا ہے کہ اب صورت حال کی اصلاح اور اس خطرناک اجتماعی خرابی کو دور کرنے کی اس طرح کے قیام اور اس طرح کی مقدس تحریک کے سوا کوئی صورت باقی نہیں ہے۔ امام حسینؑ یہ محسوس کر رہے تھے کہ دین اسلام اور امت مسلمہ کا زہرہ سنا ایک خونِ قیام کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ اِنَّ اللّٰهَ شَآءَ اَنْ يَّرَاكَ قَتِيْلًا کے مطابق شہید ہوں اور اِنَّ اللّٰهَ شَآءَ اَنْ يَّرَا هُنَّ سَبَايَا کے مطابق ان کے وہ عزیزے اور وہ بہنیں جن کو عالم اسلام کا بہترین خطیب کہا جاسکتا ہے، جن میں ایک کا نام زینبؑ ہے، ایک کا نام ام کلثومؑ ہے، ایک کا نام فاطمہؑ بنتِ امّ الحسینؑ ہے، ایک اور نام علیؑ ابنِ الحسینؑ کا ہے، یہ سب قیدی بن جائیں اور بازاروں میں پھرتے جائیں جہاں وہ مسلمانوں کو اس وقت کی شرمناک صورتِ حال کی طرف توجہ دلائیں اور ان کو مرگ و نابودی کے خطرے سے ہمیشہ کے لیے نجات دلائیں۔ اس مقدس تحریک کو جو حسینؑ بن علیؑ سے پہلے بھی موجود تھیں زندہ رکھیں اور آئندہ کی مقدس تحریکوں کے لیے راہ ہموار کریں۔

میرا دل چاہتا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ سے پہلے کی تحریکوں کی طرف بھی اگر ممکن ہو تو اشارہ کر دوں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم تحریکِ کربلا کے اسباب و محرکات کا خود سید الشہداء کی تقریروں اور تحریروں سے استنباط کریں جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ امام حسینؑ کے قیام کے اسباب آہستہ آہستہ عثمانی خلافت کے اواخر سے پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس ضمن میں، میں نے کچھ مستند تاریخی حوالے بھی دیے تھے اور امام حسینؑ کی تقریروں اور تحریروں کے بعض اقتباسات کی تشریح بھی کی تھی جن سے ان اسباب پر روشنی پڑتی ہے جنہوں نے امام حسینؑ کو قیام پر مجبور کیا۔ ترتیب وار مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ ساتویں ذی الحجہ ۶۱ھ ہجری کو حسینؑ بن علیؑ نے حجاج خانہ کعبہ کے سامنے ایک تقریر کی جس میں کسی حد تک اپنی تحریک کی وضاحت کی۔ میں نے کہا تھا کہ یہ قیام ایسا نہیں تھا کہ اس میں چندہ دے کر یا تقریر کر کے یا کوئی دینی اخبار یا رسالہ لوگوں تک پہنچا کر تعاون کیا جاسکے۔ تعاون کا ایک ہی صورت تھی، اور وہ تھی شہادت اور جان نثاری۔ میں نے گفتگو غالباً اس پر ختم کی تھی کہ امام حسینؑ نے اپنی تقریر کے آخر میں فرمایا تھا:

”مَنْ كَانَ فِتْنًا بَادِلًا مَهْجَتَهُ وَمَوْطِنًا عَلِيًّا لِقَاءِ اللَّهِ
نَفْسُهُ فَلْيَرْحَلْ مَعَنَا فَاتِنِي رَاحِلًا مُصْبِحًا
إِنْ شَاءَ اللَّهُ“

امامؑ کو تاجروں اور سوداگروں سے مالی امداد نہیں چاہیے، انہیں انشا پر دازوں کی ضرورت نہیں، انہیں صرف ایسے لڑنے والے درکار ہیں جو خدا کی راہ میں جان قربان کرنے پر خلوصِ دل سے آمادہ ہوں۔

اس طرح ہم اس تاریخی سفر کے دوران میں جو ہم نے اٹھویں کی شب میں شروع کیا تھا، مکہ معظمہ اور ساتویں ذوالحجہ تک پہنچے تھے، اب میں آپ کی اجازت سے ایک قدم پیچھے ہٹتا ہوں لیکن ایک قدم پیچھے ہٹنے کا مقصد بقول شخصے دو قدم آگے بڑھنا ہے، انشاء اللہ۔ میں مدینہ واپس چلتا ہوں اور وہ فقرہ نقل کرتا ہوں جس میں سید الشہداءؑ نے خود اپنے قیام کا مقصد زیادہ صریح اور واضح الفاظ میں بیان کیا تھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ مدینہ کے والی ولید بن عتبہ بن ابی سفیان نے یزید کے حکم سے حسینؑ بن علیؑ پر بیعت کے لیے دباؤ ڈالا تھا۔ یہ واقعہ رجب کی ستائیسویں تاریخ کو رات کے وقت ولید کے گھر پر پیش آیا۔ سید الشہداءؑ نے بیعت نہیں کی تھی بلکہ یہ وعدہ کیا تھا کہ اس بارے میں اپنی قطعاً رائے کل یا پرسوں بتلائیں گے۔ اگلے دن عبداللہ بن زبیر توڈر کے مارے مدینہ سے بھاگ کھڑے ہوئے لیکن حسینؑ بن علیؑ ۲۵ رجب ۶۱ ہجری کی رات تک مدینہ میں رہے۔ سید ابن طاووس اپنی کتاب لہوف میں لکھتے ہیں کہ :

”صحیح ہوئی تو امام حسینؑ اپنے گھر سے یہ معلوم کرنے کے لیے نکلے کہ دیکھیں سیاسی صورت حال کیا ہے اور معاویہ کی موت، یزید کی جانشینی اور ولید کے حسینؑ بن علیؑ سے بیعت یزید کا مطالبہ کرنے پر عوام میں کیا ردِ عمل ہوا ہے فَلَقِيَهُ مَرْوَانَ كَلِمًا فِي مِرْوَانَ بْنِ حَكْمٍ مَلِكًا۔ اس دن ماہ رجب کی ۲۷ تاریخ تھی۔ فَقَالَ لَهُ يَا أَبَا عَبْدِ اللَّهِ إِنِّي بَكَ نَاصِحٌ فَأَطَعَنِي تُرْسِدُ۔“

ابو عبد اللہ! میں آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں،
 اگر آپ میری بات مان لیں گے تو اچھا ہی ہوگا۔ (عجب
 جسارت! امیر طرز گفتگو تھا) فَقَالَ الْحُسَيْنُ وَمَا ذَاكَ
 قُلْ حَتَّى أَسْمَعَ۔ امام حسینؑ نے کہا: کہو کیا مشورہ
 ہے میں بھی تو سنوں۔ مروان نے کہا: أَمْرُكَ بِبَيْعَةِ
 يَزِيدَ بْنِ مَعَاوِيَةَ فَإِنَّهُ خَيْرٌ لَّكَ فِي دِينِكَ وَدُنْيَاكَ
 (اس گستاخ کی جسارت دیکھیے! کہتا ہے کہ اے حسینؑ
 ابن علیؑ میں مروان بن حکم تم کو حکم دیتا ہوں کہ یزید بن
 معاویہ کی بیعت کر لو، اس کی خلافت، امامت اور سربراہی
 کو تسلیم کر لو اور اس کو اُمت کے سربراہ کی حیثیت سے
 قبول کر لو فَإِنَّهُ خَيْرٌ لَّكَ فِي دِينِكَ وَدُنْيَاكَ کیونکہ
 میرے یعنی مروان بن حکم کے خیال کے مطابق اس میں
 تمہارے دین کی بھلائی بھی ہے اور دُنیا کی بھی۔ اگر تم یزید
 کی بیعت نہیں کرو گے تو تمہارا دین بھی برباد ہو جائے گا،
 جب کہ دُنیا تو خراب ہونا ہی ہے۔

فَقَالَ الْحُسَيْنُ عَلَيْهِ السَّلَامُ حُسَيْنٌ عَلَيْهِ السَّلَامُ
 نے فرمایا: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ۔ یہ جملہ انبیاء
 کسی مصیبت یا آفت کے آنے پر پڑھا جاتا ہے۔ معلوم نہیں
 کیا المیہ تھی۔

میرے خیال میں وہ زبردست المیہ جس کی وجہ سے حضرت
 امام حسینؑ نے اِنَّا لِلّٰهِ پڑھی، وہ مسلمانوں کا فکری انحراف

تھا، صبح ڈگر سے اس قدر دُور ہٹ گئے تھے کہ مروان کہتا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ کا دین اور ان کی دُنیا جب ہی محفوظ رہ سکتے ہیں جب وہ یزید کی بیعت کر لیں۔ اس کے بعد امامؑ نے فرمایا:

”وَعَلَى الْإِسْلَامِ السَّلَامُ“

یہ وہ فقرہ ہے جو ان تمام فقروں سے بڑھ کر امامؑ کے قیام اور ان کی تحریک کے راز کی پردہ کشائی کرتا ہے جو میں نے آٹھویں کی شب کو نقل کیے تھے۔ میں نے کہا تھا، امام حسینؑ نے فرمایا: ”میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کروں“ شاید کسی کو خیال ہوا ہو کہ حسینؑ یہ چاہتے ہیں کہ جاکر کوفہ کے سبزی فروشوں سے کہیں کہ کم مت تولو، وہاں کے تاجروں سے کہیں کہ سُود مت کھاؤ، کوفہ کے واعظوں سے کہیں کہ نمبر پر جھوٹی باتیں مت سُناؤ، میری تیری خوشامد مت کرو، لوگوں کا وقت بے بنیاد باتوں میں ضائع نہ کرو، مگر حسینؑ بن علیؑ جو کام کرنا چاہتے تھے، وہ یہ نہیں تھا، ان کے سامنے جو مسئلہ تھا وہ اس سے بہت اہم تھا، یہ کام تو شہر کے واعظ بھی انجام دے سکتے تھے۔ جو کام حسینؑ بن علیؑ کرنا چاہتے تھے وہ تو یہ تھا کہ اُمتِ مسلمہ کی افسوسناک حالت کو سدھارا جائے اور ایک تند و تیز قیام کے ذریعے معاشرے کے غیر معمولی بگاڑ کی اصلاح کی جائے۔ اس جُبلے سے ایک حد تک امام حسینؑ کے قیام کے محرکات پر روشنی پڑتی ہے:

وَعَلَى الْإِسْلَامِ السَّلَامُ اذْ قَدْ بَلَّيْتَ الْأُمَّةَ
بِرَاعٍ مِثْلِ يَزِيدٍ وَلَقَدْ سَمِعْتُ جَدِّي رَسُولَ اللَّهِ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : الْخِلَافَةُ
 مُحَرَّمَةٌ عَلَىٰ آلِ أَبِي سَفْيَانَ . آپ نے فرمایا کہ
 ایسے اسلام کو جس کا رہبر یزید ہو دُور سے ہی ہمارا
 سلام ہے۔ یعنی نوبت یہ آگئی ہے کہ یزید بن معاویہ
 جیسا شخص مسلمانوں کا امام اور زعمیم (سربراہ و قائد)
 بن گیا ہے حالانکہ میں نے اپنے نانا خاتم الانبیاءؐ سے سنا
 ہے، آپ فرماتے تھے کہ خلافت آلِ ابی سفیان پر حرام
 ہے کیونکہ وہ اس قابل نہیں کہ مسلمانوں کے سربراہ بنیں
 اور ان پر حکومت کریں۔ وَطَالَ الْحَدِيثُ بَيْتَهُ وَ
 بَيْنَ مَرْوَانَ اس پر حضرت امام حسینؑ اور مروان کے
 درمیان بات بڑھ گئی۔ حَتَّىٰ انْصَرَفَ مَرْوَانُ وَهُوَ
 غَضْبَانَ آخر گر ماگرم گفتگو کے بعد مروان غصے سے
 بھرا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اسی طرح کی بات ہمیں ایک اور جگہ پر بھی ملتی ہے، یہ امام حسینؑ
 کا ایک خط ہے۔ اہل کوفہ نے امامؑ کی خدمت میں اپنے تمام خطوط تین
 قسطوں میں مکہ معظمہ بھیجے تھے۔ یہ نکتہ بھی اس سلسلے میں یاد رکھنے کے
 قابل ہے۔ وہ تمام خطوط جو اہل کوفہ نے بارگاہِ سید الشہداءؑ میں بھیجے تھے
 اور جن میں آپ کا ساتھ دینے اور آپ کی مقدس تحریک کی حمایت کرنے پر
 آمادگی ظاہر کی تھی تین قسطوں میں پہنچے تھے، ان کے علاوہ کوئی متفرق
 خط نہیں تھا۔ خطوط کی ایک کھیپ رمضان کی دس تاریخ کو پہنچی۔
 دوسری بارہ کو۔ اور تیسری کے متعلق مجھے کوئی تصریح نہیں ملی کہ کب پہنچی۔

البتہ یہ تصریح ہے کہ دوسری کھپی کے دو دن بعد تیسری کھپی کو فہ سے بھیجی گئی۔ قاعدے کی رو سے دوسری کھپی کے دو ہی دن بعد اس کو مکہ پہنچا جا ہیے تھا، اس بات کا ایک اور بھی ثبوت موجود ہے مگر اس کی تفصیل بیان کرنے کا اس وقت موقع نہیں۔ ہر کیف قاعدہ کی رو سے اہل کوفہ کے خطوط کی تیسری کھپی ۱۲ رمضان سنہ ۶۱۰ کو پہنچی ہوگی، اس طرح تین دفعہ کر کے اور چھ روز کے اندر اہل کوفہ کے تمام خطوط اور عہد نامے اور اقرار نامے پہنچے اور اسی اثناء میں امام حسینؑ نے بھی مسلم بن عقیل کو عراق بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ مسلم بن عقیل کی روانگی کی تاریخ قطعی طور پر معلوم ہے، یہ تاریخ ۱۵ رمضان تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل کوفہ کے خطوط کی آخری کھپی کے پہنچنے کے ایک دن بعد آپ نے مسلم کو کوفہ بھیجا۔

اب یہ ایک خط ہے جو امام حسین علیہ السلام نے مسلم بن عقیل کو عراق بھیجنے سے پہلے اہل کوفہ کے خطوط کے جواب میں سعید بن عبد اللہ حنفی اور ہانی بن ہانی سمیع ہمدانی کے ہاتھ ارسال کیا تھا۔ یاد رہے کہ ان میں سے اول الذکر یعنی سعید بن عبد اللہ حنفی شہداء کے ربلا میں سے ہیں۔ اس خط میں بھی حسین بن علیؑ اپنی تحریک کا راز بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”فَلْحَمْرِي مَا الْإِمَامُ إِلَّا الْعَامِلُ بِالْكِتَابِ.

اپنی جان کی قسم! امام وہی ہوتا ہے جو قرآن کے مطابق عمل کرتا ہو۔“

مطلب یہ ہے کہ اس قیام اور تحریک کا مقصد عراق کے دستکاروں کو مسائل اور احکام سکھانا نہیں ہے، معاملہ کچھ اور ہے۔ اسلامی حکومت

اور مسلمانانِ عالم کی حالت کچھ ایسی دگرگوں ہو چکی تھی کہ امام حسینؑ جیسی شخصیت کے قیام کے علاوہ اس کی اصلاح کے لیے کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی تھی، آپ نے لکھا کہ

فَلَحَمَّرَنِي مَا لِإِمَامٍ إِلَّا الْعَامِلُ بِالْكِتَابِ،
الْقَائِمُ بِالْقِسْطِ.

چاہے امام کا لفظ آئے یا راعی (لفظی معنی جرواہا) کا لفظ آئے یا مؤلاً کا لفظ استعمال ہو جیسے کہ حدیثِ غدیر میں ”مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهَذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ“ آیا ہے یا سلطان کہا جائے، دین کی زبان میں ان سب سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو رسولِ اکرمؐ کے جانشین کی حیثیت سے امتِ مسلمہ پر حکومت کرے، اس کے فیصلوں کا دار و مدار قرآن پر ہو۔

”الْقَائِمُ بِالْقِسْطِ انصاف سے کام لے،
الدَّائِمُ بِدِينِ الْحَقِّ خود دینِ حق کا پابند ہو یا
دوسروں سے دینِ حق کی پابندی کرتے (دونوں معنی
صحیح ہیں) الْحَائِسُ نَفْسَهُ عَلَى ذَاتِ اللَّهِ خدا کے
لیے اپنے آپ کو وقف کرے“

یعنی امت کی امامت اور پیشوائی کے لائق وہی ہے جس کا مقصد رضائے الہی کے سوا کچھ نہ ہو۔ علیؑ ذاتِ اللہ کے بھی ایسے ہی وسیع معنی میں جیسے فی سبیل اللہ کے۔ ہر وہ کام جو امت کے فائدے اور بھلائی کے لیے ہوا راہِ خدا میں سمجھا جائے گا۔ راہِ خدا صرف نماز پڑھنے، روزہ رکھنے یا بیت اللہ کراچ کرنے تک ہی محدود نہیں ہے، امتِ مسلمہ کی بھلائی اور ترقی کے لیے جو قدم بھی اٹھایا جائے اور جو اقدام بھی مسلمانان

عالم کو اسلامی مقاصد کے نزدیک ترک کرنے اور ان کو ایسی طاقت بننے میں مدد دے جو پیرانِ قرآن کی شان کے شایان ہو، وہی راہِ خدا ہے اور اسی راستے پر چلنا اپنے آپ کو ذاتِ خدا کے لیے وقف کرنا ہے۔

الْحَابِسُ نَفْسَهُ عَلَى ذَاتِ اللَّهِ. وَالسَّلَامُ

محمد بن جریر طبری نے اپنی مشہور کتاب تاریخ الأمم والملوک میں امام حسینؑ کی ایک اور مختصر تقریر نقل کی ہے جو آپ نے منزل ”ذی حستم“ میں کی تھی۔ اس نام کے تلفظ میں کچھ اختلاف ہے جو تلفظ میں نے کیا ہے، شاید وہی زیادہ صحیح ہے۔ یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں پہنچ کر دشمن کے ہراول دستے نے یہ خطرہ پیدا کر دیا تھا کہ امام حسینؑ عراق لشکر سے حضور ہو جائیں۔ یہاں امام نے ایک خطبہ دیا تھا جس میں اپنے قیام کارازبیلان کیا:
 إِلَّا تَرَوْنَ أَنَّ الْحَقَّ لَا يُعْمَلُ بِهِ وَأَنَّ الْبَاطِلَ لَا يَتَنَاهَى عَنْهُ.

”کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ حق پر عمل نہیں کیا جا رہا اور باطل سے بچا نہیں جا رہا؟“

اور جب اُمت کی حالت ایسی ہو جائے تو سید الشہداءؑ جیسی ذمہ دار شخصیت پر قیام واجب ہو جاتا ہے، کیا تم خود نہیں دیکھ رہے ہو؟ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو کہ آپ بیعت کیوں نہیں کر لیتے اور اس اسلامی حکومت کو قبول کر کے فرزندِ معاویہ بن ابی سفیان کو ملتِ اسلامیہ کا رہبر و قائد کیوں تسلیم نہیں کر لیتے۔ حاصل یہ کہ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں، ملتِ اسلامیہ کی موجودہ صورتِ حال کو تم خود کیوں نہیں دیکھتے؟
 تَرَوْنَ أَنَّ الْحَقَّ لَا يُعْمَلُ بِهِ کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حق پر

عمل نہیں کیا جا رہا؟ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ جھوٹ بولنے لگے ہیں یا اپنے گھروں میں بہت غیبت کرتے ہیں۔ اس طرح کی معصیتیں تو لوگوں میں ہمیشہ ہی رہی ہیں مگر کیا تم نہیں دیکھتے کہ اسلامی قیادت حق و انصاف کی راہ سے کس قدر دُور ہٹ گئی ہے اور اس کا کام ظلم اور ظالموں کی تائید بن گیا ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور باطل سے اجتناب نہیں برتا جا رہا۔

لِيَرْعَبَ الْمُؤْمِنِينَ فِي لِقَاءِ اللَّهِ .

یہ جملہ خبریہ بھی ہو سکتا ہے اور انشائیہ بھی۔ یعنی اس کے معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ

”ایسی افسوسناک صورت حال میں مومن کو چاہیے کہ وہ شوق شہادت میں اٹھ کھڑا ہو اور جان کی قربانی دینے اور خدا سے ملنے کے لیے تیار ہو جائے“

یہ وہی بات ہے جو آپ نے مسجد الحرام میں بھی کہی تھی۔ جیسا کہ سید ابن طاووس نے لُہوف میں اور علی بن عیسیٰ نے کشف الغمہ میں نقل کیا ہے۔ وہاں بھی آپ نے شہادت، قربانی اور جاں نثاری کی بات کی تھی یہاں بھی آپ نے فرمایا کہ

قَاتِي لَا أَرَى الْمَوْتَ إِلَّا سَعَادَةً وَلَا الْحَيَاةَ
مَعَ الظَّالِمِينَ إِلَّا بَرَمًا .

”ان حالات میں مرجانے کو میں اپنی اقبال مندی سمجھتا ہوں کیونکہ ظالموں کے ساتھ جینا مجھ پر شاق ہے“

سامعین! میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے مختصر طور پر کہوں اور

کسی حد تک اس وعدے کا پاس کروں جو اس مجلس کے منتظمین نے آپ سے کیا ہے کہ دس بجے مجلس ختم ہو جائے گی۔ اگرچہ میں یہ بھی عرض کر سکتا ہوں: اِقْرَارُ الْعُقُلَاءِ عَلَىٰ اَنْفُسِهِمْ جَائِزٌ. عقلمند اپنے قول کے خود ہی پتہ دار ہوتے ہیں۔ میں نے تو کوئی وعدہ کیا نہیں تھا اس لیے میں کیوں کسی وعدے کی پابندی کروں۔ بہر حال ان کی عورت کا بھی خیال رکھنا ہے۔

صاحبِ اسد الغابہ ابن اثیر جزری کی ایک کتاب الکامل فی المتایغ ہے، انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں اسلامی ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں ابن اثیر الکامل میں کہتا ہے:

خر بن یزید ریاحی سے سامنا ہونے کے بعد امام حسینؑ نے دو خطبے دیے، ایک خطبہ ظہر کی نماز سے پہلے اور دوسرا عصر کی نماز کے بعد۔ عصر کے بعد امام حسینؑ نے اٹھ کر ایک تقریر کی اور خر بن یزید ریاحی اور ان کے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا:

اَمَّا بَعْدُ : يَا أَيُّهَا النَّاسُ فَإِنَّكُمْ أَنْ تَتَّقُوا
اللَّهَ وَتَعْرِفُوا الْحَقَّ لِأَهْلِهِ يَكُنَّ أَرْضَىٰ لِلَّهِ.
لوگو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے اور اہل حق کا حق تسلیم
کرو گے تو یہ زیادہ اللہ کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔

یہاں بھی حق سے آپ کی مراد اس قسم کا حق نہیں کہ کسی نے ہمسائے کی دیوار کاٹ دی یا کوئی قطار میں اپنی باری کا انتظار کرنے کے بجائے کسی دوسرے مسافر کی باری پر بس میں سوار ہو گیا، یہاں وہ حق مراد ہے جس پر تمام حقوق کی بنیاد ہے، جس حق کو نقصان پہنچنے سے تمام حقوق کو نقصان پہنچتا

ہے اور جس کے محفوظ رہنے سے دوسرے تمام حقوق کے محفوظ رہنے کا راستا
 کھلا رہتا ہے، یہ حق ہے ملتِ اسلامیہ کی سربراہی اور پیشوائی کا۔
 فَإِنَّكُمْ أَنْ تَتَّقُوا اللَّهَ وَتَعْرِفُوا الْحَقَّ لِأَهْلِهِ
 يَكُنْ أَرْضَىٰ اللَّهُ .

اس کے بعد اور بھی وضاحت سے کہا :

وَنَحْنُ أَهْلُ الْبَيْتِ أَوْلَىٰ بِوِلَايَةِ هَذَا الْأَمْرِ .

ہم اہل بیتِ رسولؐ اور وارثانِ خاتم الانبیاءؑ سب
 سے زیادہ اس کے مستحق ہیں کہ تمہارے حاکم اور تمہارے
 دین اور دنیا کے قائد اور سربراہ ہوں۔

مِنْ هَؤُلَاءِ الْمُدَّعِينَ مَا لَيْسَ لَهُمْ .

ہم ان لوگوں سے زیادہ حقدار ہیں جو اس منصب
 کا غلط دعویٰ کرتے ہیں جس کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

وَالسَّائِرِينَ فِيكُمْ بِالْجَوْرِ وَالْعُدْوَانِ .

اور جو لوگ تم پر ظلم اور زبردستی کر رہے ہیں۔

مطلب یہ کہ یہ لوگ ہاشمینانِ پیغمبرؐ اور قرآن کو رواج دینے والے
 تسلیم نہیں کیے جاسکتے۔ وَالسَّائِرِينَ فِيكُمْ بِالْجَوْرِ وَالْعُدْوَانِ .

ابن جریر طبری نے بھی امام حسینؑ کا ایک خطبہ نقل کیا ہے جو آپ
 نے منزلِ بقیعہ میں دیا تھا۔ بقیعہ حجاز اور عراق کے درمیان ایک منزل
 ہے اور شاید عراق کی سرزمین کا حصہ ہے۔ مؤرخ ابن جریر طبری کے
 علاوہ امام حسین علیہ السلام کے اس خطبہ کو دوسرے مؤرخین وغیرہ
 نے بھی نقل کیا ہے۔ یہاں میں یہ عرض کر دوں کہ

اس موقع پر سید الشہداءؑ نے اپنے مقصد کا مزید انکشاف کیا اور بتلایا کہ آپ کی رائے میں صورت حال کیا تھی اور آپ نے کیوں قیام کیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ

”میرے نانا اور آپ کے پیغمبر نے فرمایا ہے کہ جو کوئی کسی ظالم سلطان، امام یا رہنما کو دیکھے کہ وہ خدا کی حرام کی ہوتی چیزوں کو حلال سمجھتا ہو، خدا سے کیے ہوتے عہد کو توڑتا ہو اور رسول اکرمؐ کی سنت کی مخالفت کرتا ہو، (اشارہ یزید کی طرف تھا جس کا یہی حال تھا۔ یزید ان ظالم اماموں میں سے تھا جن کے بارے میں آپ قرآن میں بڑھتے ہیں: وَمِنْهُمْ أَسَمَةَ لِدَعْوَانِ إِلَى السَّارِ سَبِّبِشُوا ابْنِي قَوْمٍ كُوْبَهَشْتِ كِي طَرْفِ نَهِي لِي بَاتِي كِي كُجْ رِهِنَمَا تُو اِيَسِي هِي جُو اِبْنِي جَمَاعَتِ كُو بَهَشْتِ كِي طَرْفِ لِي جَلْتِي هِي لِي عِنِي دُنْيَا وَاخْرَتِ مِي اِن كِي تَرْقِي وَاوْخُو شَخَالِي كِي طَرْفِ لِي كِنِ قُرْآنِ كِي فَرْمَانِ كِي بَمُو جَبِ كُجْ رِهِنَمَا اِيَسِي هِي جُو اِبْنِي قَوْمِ كُو عَذَابِ، آگ اور تباہی كِي طَرْفِ دِهْلِي كِي تِي هِي اِن كِي اِيَكِ نَمَائِيَا لِي مِثَالِ يَزِيدِ بِنِ مَعَاوِيَةِ هِي، يِهَا اِشَارَةُ اِسِي كِي طَرْفِ هِي) جُو لُو كُو پَر ظَلَمِ كِرْتَا هُو، جُرْمِ وُكْنَاهِ جِس كَا شَعَارِ هُو اور لُو كُو كِي حَقُوقِ پَا مَالِ كِرْتَا هُو فَلَمْ يَعْزُبْ عَلَيْهِ بِنْفَعِلِ وَلَا قَوْلِ بَسِ جُو مُسْلِمَانِ اِيَسِي صُورَتِ حَالِ دِي كِي جِيَسِي آجِ مِي (حُسَيْنِ بِنِ عَلِيٍّ) يَزِيدِ كِي حَكُومَتِ مِي دِي كِي رِهَا هُو اور پُجْرِ هِي وَهُ مُسْلِمَانِ اِسِ صُورَتِ حَالِ كُو

اپنے قول و فعل سے بدلنے کی کوشش نہ کرے اس ظالم سلطان کے مقابلے میں اٹھ نہ کھڑا ہو، کوئی عملی اقدام نہ کرے یا کم از کم زبان ہی سے اس کی مخالفت نہ کرے تو پھر خدا کو اختیار ہے کہ اس مسلمان کو بھی وہیں لے جائے جہاں اس ظالم حکمران کو لے جائے گا اور دونوں کے ساتھ یکساں سُلوک کرے۔“

اس کے بعد فرمایا کہ

”اس وقت سنہ ہجری میں ملتِ اسلامیہ کو بھی

اسی صورت حال کا سامنا ہے۔ اَلَا وَاِنَّ هٰؤُلَاءِ قَدْ لَزِمُوْا طَاعَةَ الشَّيْطٰنِ دِكْهُوْا اَنْ لُّوْا لِيْزِيْدٍ اور اس کے گناہوں نے مستقل طور پر شیطان کی فرمانبرداری اختیار کر لی ہے وَتَرْكُوْا طَاعَةَ الرَّحْمٰنِ اور ان لوگوں نے پروردگارِ عالم کی فرمانبرداری چھوڑ دی ہے وَآخِظَرُوْا الْفَسَادَ اور کھلم کھلا بدعنوانیاں کر رہے ہیں وَعَظَلُوْا الْحُدُوْدَ انھوں نے حدود کو معطل کر دیا ہے۔ (اگر کوئی تاجر یا عام آدمی کوئی جرم کرے تو اس کو اسلامی حدود کے مطابق سزا دیتے ہیں لیکن جو لوگ ان کے منظورِ نظر اور ان کے مفاد میں کام کرتے ہیں، اگر ان میں سے کوئی ایک چھوڑ سو جرم بھی کرے تو اس کو ایک کوڑا بھی نہیں لگاتے۔“

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، اس اصول کی ابتدا خلافتِ عثمانیہ کے نصفِ دوم ہی میں ہو گئی تھی اور اسی وقت سے حکومت کے خلاف

احتجاج اور قیام بھی شروع ہو گیا تھا، میں ان احتجاجوں کی ایک فہرست پیش کروں گا۔

وَعَظَلُوا الْحُدُودَ حُدُودَ مَعْطَلٍ كَرْنِ كَا يَه مَطْلَبٌ نَهَيْسُ كَه كَسِي
 پر حد جاری نہیں کرتے تھے، خود یزید کے زمانے میں بھی لوگوں کے ہاتھ کاٹے
 جاتے تھے، زنا کاروں پر بھی حد جاری ہوتی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ
 ڈاکوؤں کی گردن مار دی جاتی تھی یا اور مختلف ایذائیں دے کر انھیں
 سزا دی جاتی تھی۔ بہر حال یہ طے ہے کہ اس وقت کا پورا نظام شخصی
 مصالحتوں اور حکمرانوں کے مفاد کی بنیاد پر چلتا تھا نفیاً بھی اور اثباتاً
 بھی۔ یعنی جس کو چاہتے تھے چھوڑ دیتے تھے اور جس کو چاہتے تھے سزا
 دے دیتے تھے۔ سید الشہداءؑ کہتے ہیں کہ یہی سب کج رویاں اور
 بدعنوانیاں میرے قیام کا سبب بنی ہیں، یزیدی حکومت کی ایک بڑی
 بدعنوانی یہ ہے کہ

”وَاسْتَثَرُوا بِالْفِئَاءِ عَوَامَ كَامَالِ جَوَانِ كَفَانِهٖ
 کے لیے اور ان کی مشکلات دور کرنے کے لیے خرچ کیا
 جانا چاہیے تھا وہ ارباب اقتدار نے اپنے لیے مخصوص کر لیا
 وَاسْتَثَرُوا بِالْفِئَاءِ وَاحْتَلَوْا حَرَامَ اللّٰهِ اَوْرَجِن
 باتوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے وہ ان لوگوں نے حلال
 کر دیں وَحَرَمُوا حَلَالَہٗ اَوْرَجِن چیزوں کو اللہ نے
 حلال قرار دیا ہے وہ ان لوگوں نے حرام کر دیں وَ اَنَا
 اَحَقُّ مِنْ غَیْرِہٖ“

وَ اَنَا اَحَقُّ مِنْ غَیْرِہٖ كَا جُمْلَہٗ كہہ كرامامؑ بتا رہے ہیں کہ :

”جب یہ صورتِ حال ہے اور رسولِ خداؐ کا حکم اس صورت میں یہ ہے تو مجھ سے بڑھ کر کون شخص اس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے موزوں ہو سکتا ہے، میں جنابِ طاہرہؑ کا بیٹا ہوں، اہل کسار میں سے ہوں، میں ان میں سے ہوں جن کی شان میں آیۃِ تطہیر اور آیۃِ مہلبہ نازل ہوئی، میں امیر المؤمنین علیؑ کا فرزند ہوں تو پھر مجھ سے موزوں اور کون ہے جو اس صورتِ حال کو بدلے جس میں اُمت کے زوال کے سبب عوامل اور اسباب جمع ہو گئے ہیں“

حُسنؑ سے بہتر کون ہے جو آئے اور قیام کرے، ابن عباس کی وہ بات نہیں، محمد بن حنفیہ کی بھی وہ بات نہیں، حبیب بن مظاہر صحابی ہیں لیکن وہ بھی وہ کام نہیں کر سکتے جو حسینؑ کر سکتے ہیں، یہی صورتِ مُسَلِّم بن عوسجہ اور ہانی بن عروہؑ مرادی کی ہے۔ حسینؑ کے چچا زاد بھائی مُسَلِّم بن عقیل، ان کے اپنے بھائی ابوالفضل العباس ایسے لوگ ہیں جو اس قیام کے مقصد کے لیے جان لٹا سکتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اس مقدس تحریک کا مرکزی نقطہ نہیں بن سکتے۔ اس تحریک کا مرکزی نقطہ تو حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب ہی کی شخصیت ہے۔

عاشورا کے دن، اس کے باوجود کہ امام حسینؑ دیکھ رہے تھے کہ مخالفین ان کے قتل پر کمر بستہ ہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہونے والے ہیں، آپ کو اطمینان تھا کہ حبیباً کہ آپ چاہتے تھے ویسا ہی ہو رہا ہے پھر بھی آپ نے ایک خطبے میں اسی

مضمون سے گفتگو کا آغاز کیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ امام حسینؑ نے عاشورا کے دن کئی خطبے دیے اور کئی تقریریں کیں۔ یہ سب خطبے انتہائی فصیح و بلیغ اور مؤثر ہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ یہ خطبے ایک ایسے خطیب کے ہیں جو خوب جانتا تھا کہ ان تقریروں کے بعد نہ صرف اس سے باز پرس کی جائے گی بلکہ یہ باز پرس تیس ہزار نیروں کی مدد سے کی جائے گی۔

یہ خطبے ایک ایسے خطیب کے ہیں جو بیایا تھا اور اپنے ہونٹوں کو تر کرنے کے لیے جس کو پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر بعد اس کے زن و فرزند گستاخ اور سنگدل دشمنوں کے ہاتھوں میں قید ہونے والے ہیں، جس کو قطعاً کھانے کے لیے کافی غذا نہیں مل سکتی تھی لیکن اس نے بیاس کی تو بھر بھی شکایت کی لیکن ازارہ خود داری بھوک کی قطعاً شکایت نہیں کی۔ گو یہ حقیقت ہے کہ سید الشہداء بھوکے بھی تھے۔ امام سجادؑ کہتے ہیں کہ ”رسول خداؐ کے نواسے کو اس حال میں قتل کیا گیا کہ آپ تشنہ لب اور بھوکے پیٹ تھے“

ایک بھوکا پیاسا خطیب دشمن کے ان تیس ہزار سپاہیوں کے سامنے تقریر کرتا ہے جن کے نیزے اس کو قتل کرنے کے لیے تیار ہیں اور جن کے گھوڑے کچھ دیر بعد اس کے بدن کو پامال کریں گے اس کے باوجود وہ تقریر کرتا ہے اور ٹھوس تقریر کرتا ہے، اس کی تقریر میں فصاحت اور پختگی ہے، وہ اپنی کمزوری اور بے بسی کا اظہار نہیں کرتا۔ جیسے اُس کے ساتھیوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے، اُس کی تقریر کا زور بڑھتا جاتا ہے وہ اپنی بات زیادہ صفائی اور وضاحت سے کہنے لگتا ہے۔ کیا پوری

انسانی تاریخ میں کسی نے ایسا خطیب دیکھا ہے جس کی تقریر کا اسلوب
 کسی صورتِ حال سے بھی متاثر نہ ہو، جو کسی حال میں پریشان نہ ہو اور
 جس کی تقریر کی روانی میں کسی طور فرق نہ آئے ؟
 ایک تقریر میں آپ نے کہا:

تَبَّأَ لَكُمْ آيَتُهَا الْجَمَاعَةُ وَتَرَحًّا.

بد بختو! تم پر خدا کی مار۔ تم مجھے یہاں قتل
 کرنے اور اپنی رسوائی کا سامان جمع کرنے کے لیے اکٹھے
 ہوئے ہو؟

حِينَ اسْتَصْرَحْتُمُونَا وَالْهَيْنَ فَاصْرَحْنَاكُمْ
 مُوجِفِينَ.

کیا تم وہی نہیں ہو جنہوں نے ایک ماہ پیشتر بڑے
 شوق و ذوق سے ہم سے فریاد کی تھی کہ ہم یزید بن
 معاویہ کو بھینٹ سہرا قبول کرنے کو تیار نہیں؟ ہم
 نے تمہاری فریاد کا ہمدردانہ جواب دیا اور ہم آگے، اب
 تم یہ کیا کر رہے ہو؟

سَلَلْتُمْ عَلَيْنَا سَيْفًا لَنَا فِي أَيَّمَا لَكُمْ وَ
 حَشَشْتُمْ عَلَيْنَا نَارًا اقْتَدَحْنَاهَا عَلَى عَدُوِّنَا
 وَعَدَدُكُمْ.

اس نکتے کی طرف ذرا توجہ کیجیے، عجیب جملہ ہے، فرمایا:
 معلوم ہے تم حسین بن علیؑ اور اسلام کے بہترین
 اور مخلص ترین جاثباتِ سپاہیوں کے خلاف کون سی تلواریں

سونت ہے ہو؟ یہ وہی تلواریں ہیں جو پیغمبر اسلام نے
 تمھارے ہاتھوں میں دی تھیں۔ جو آگ کہ ہم نے اپنے
 اور تمھارے دشمن کو بھسم کر دینے کے لیے جلائی تھی وہی
 آگ اب تم ہمیں جلانے اور تباہ کرنے کے لیے استعمال
 کر رہے ہو۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ اللَّهِ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا جَاءْنَاكُمْ

امام حسینؑ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ یزید بن معاویہ جو
 آج تم مسلمانوں کا خلیفہ بن گیا ہے، یہ تمھارا دوست نہیں دشمن ہے۔
 تمھارے اندر دوست اور دشمن میں تمیز کرنے کی صلاحیت باقی نہیں ہی
 اس لیے تم یہ فرق نہیں کر سکتے کہ کس کا ساتھ دینا تمھارے لیے مفید
 ہے اور کس کا ساتھ دینا نقصان دہ۔

تم سب اپنے دشمنوں کے مفاد میں اپنے دوستوں
 کے خلاف متحد ہو گئے ہو۔

بَغَيْرِ عَدْلٍ أَفْتَوْهُ فَبِكُمْ وَلَا أَمَلٍ أَصْبَحَ
 لَكُمْ فِيهِمْ.

حالانکہ انھوں نے کبھی تمھارے ساتھ انصاف نہیں
 کیا اور نہ آئندہ تمھیں ان سے کوئی اُمید ہے۔
 عاشورے کے دن ایک اور خطبے میں فرمایا :

أَلَا وَإِنَّ الدَّعِيَّ بْنَ الدَّعِيِّ قَدْ كَرِهْتَنِي بَيْنَ اثْنَيْنِ.

یہ نہ بھجویے گا کہ عاشورہ کے دن جب امام حسینؑ آتقدیر کر رہے
 تھے، وہ بُری طرح دشمنوں کے زرخ میں تھے، ان کے اصحاب کی محدود

تعداد کے علاوہ کوئی بھی ان کا دوست اور خیر خواہ وہاں موجود نہیں تھا بلکہ اصحاب میں سے بھی اکثر صبح کے سخت حملے اور تیروں کی بوچھاڑ کے نتیجے میں شہید ہو چکے تھے، جو باقی تھے وہ بھی زخموں سے چور تھے۔ ان حالات میں اس عظیم شخصیت نے اپنے دشمنوں کو مخاطب کر کے کہا:

أَلَا وَإِنَّ الدَّعِيَّ بْنَ الدَّعِيِّ قَدَرَكُنِي

بَيْنَ اثْنَتَيْنِ .

خُدا کی قسم! اگر حسین بن علیؑ میں اور کوئی بھی ایسی خوبی نہ ہوتی جس کی وجہ سے آزاد انسان ان پر فریفتہ ہوں تو اپنی تحریک اور اپنے قیام کے جواز میں ان کا طرز استدلال ہی اس کے لیے کافی تھا کہ آپ کو ان تمام لوگوں کا سردار تسلیم کر لیا جائے جو قیامت تک حق و انصاف کی طرفداری اور ظلم کی سرکوبی کے لیے اُٹھتے رہیں گے۔ آپ نے فرمایا:

أَلَا ! إِنَّ الدَّعِيَّ بْنَ الدَّعِيِّ قَدَرَكُنِي بَيْنَ
اثْنَتَيْنِ بَيْنَ السَّلَّةِ وَالذَّلَّةِ .

مے اہل کوفہ! دیکھو میں نے اجتماعی صورت حال کا بغور جائزہ لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اصل بات کیا ہے حرام کار باپ کے حرام کار بیٹے عبید اللہ ابن زیاد ابن ابیہ نے مجھے اس طرح باندھ کر رکھ دیا ہے کہ میرے لیے ان دو میں سے کوئی ایک راستا اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا سوائے اس کے کہ میں ان میں سے کوئی ایک طریقہ اختیار کروں یا تو تلواریں نیام سے نکال

لی جائیں اور جنگ شروع ہو جائے یا پھر ذلت و خواری
قبول کر لوں۔“

بندہ عرض کرتا ہے کہ یہاں ذلت و خواری قبول کرنے سے محض
یہ مراد نہیں کہ میں خود اپنے لیے ذلت قبول کر لوں بلکہ یہ ہے کہ میں اُمت
کے لیے ذلت، بے بسی اور زبوں حالی کا راستا کھول دوں، وہ اُمت کہ
جسے خدا و رسولؐ نے عبرت بخشی اور سر بلند کیا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس
باعث اور بلند مرتبہ اُمت کو حسینؑ بن علیؑ اپنی امامت کے زمانے میں
ذلیل ہونے کی اجازت دیں۔

”وَهَيْهَاتَ مِمَّا الذَّلَّةُ“

”لیکن یہ سمجھ لو کہ میرا فیصلہ قطعی اور اٹل ہے، میں
نے جنگ کے راستے کا انتخاب کر لیا ہے کیونکہ ہم ذلیل
ہونے والے نہیں۔“

بہ الفاظ دیگر :

”ملتِ اسلامی سے ذلت کو سوں دُور ہے، اس اُمت
کو خدا نے معزز پیدا کیا ہے۔“

وَهَيْهَاتَ مِمَّا الذَّلَّةُ يَا بَنِي اللَّهِ ذَلِكَ لَنَا
وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ.

یہ بات کہ ہم ذلیل ہوں، نہ اللہ کو پسند ہے نہ
اُس کے رسولؐ کو اور نہ مومنین کو۔
وَحُجُورًا طَابَتْ وَطَهَّرَتْ.

ہم نے ماؤں کی جن پاکیزہ گودوں میں پرورش پائی

ہے ان کو یہ منظور نہیں کہ ہم اپنے یا اُمت کے لیے ذلت
 و خواری اور مایوسی اور نا اُمیدی کا دروازہ کھولیں۔
 وَالنُّوفَ حَمِيَّةٌ وَنَفُوسٌ اَبِيَّةٌ مِّنْ اَنْ نُؤْتَرَ
 طَاعَةَ الْمَلِكِ عَلٰى مَصَارِعِ الْكِرَامِ .

یہاں طاعتِ لُتَام کا نکتہ بھی عجیب ہے، فرمایا کہ:
 یہ بہادر اور جاں نثار جو میرے ہیں، یہ
 جواں مرد جو میرے ساتھ آتے ہیں اور میرے ارد گرد
 صف آرا ہیں ان کو بھی اپنی اور اُمت کی خواری منظور
 نہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں جو ادنیٰ درجے کے کینے لوگوں کی
 اطاعت اور فرماں برداری کو شہادت اور جاں نثاری
 پر ترجیح دیں۔

علیٰ بن الحسینؑ یعنی علی اکبرؑ نے جب عاشورے کے دن رجز پڑھا
 تو اپنے والد کی اس بات کو اپنے رجز کا عنوان قرار دیا ہے

اَنَا عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ

نَحْنُ وَبَدَيْتُ اللّٰهَ اَوْلٰى بِالنَّبِيِّ

اَطْعَمَكُمْ بِالزَّمْعِ حَتّٰى يَنْشَبِنِي

اَضْرَبَكُمْ بِالسَّيْفِ اَحْمٰى عَنِ ابْنِ

ضَرْبِ عَلَامٍ هَا شَمِيَّ عَرَبِيٍّ

وَاللّٰهُ لَا يَحْكُمُ فِينَا ابْنُ الدَّعِيِّ

”میں حسین بن علیؑ کا بیٹا ہوں۔ ہم اور بیٹ اللہ
 نبیؐ سے قریب تر ہیں۔ میں تمہارے نیزہ گھونپتا رہوں گا

یہاں تک کہ میرا نیزہ مڑ جائے۔ میں تمہیں تلوار کی ایسی ضرب لگاؤں گا جو میرے والدِ گرامی سے بھی شدید تر ہوگی، یہ ضرب ایک ہاشمی و عربی نوجوان کی ضرب ہوگی بخدا حرامی کا بیٹا ہم پر حکومت نہیں کر سکتا۔“

سید الشہداءؑ کے کچھ فرمان، اقوال اور تحریریں میں نے اس رات نقل کی تھیں اور کچھ آج نقل کی ہیں۔ اس مضمون کے آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ عاشورے کے دن اپنے ایک خطبے میں امام حسینؑ نے کچھ شعر بھی پڑھے تھے۔ امام حسینؑ کی تحریک کے اسباب کم و بیش واضح ہو چکے تھے۔ آپ کو اپنی تحریک کے ہر مرحلے میں اپنی کامیابی کا مکمل یقین تھا۔ آپ مطمئن تھے کہ آپ کی جدوجہد نتیجہ خیز ہوگی۔ آپ کی کوشش اور آپ کے ہمراہیوں کی جانبازی راتیں گان نہیں جائے گی۔

اپنے ایک خطبے میں سید الشہداء نے فرّوخ ابن مسیّک مرادی کے اشعار پڑھے تھے۔ فرّوخ ابن مسیّک ایک بزرگ صحابی تھے۔ ان کے اشعار عجیب روح پرور اور پُر معنی ہیں۔ امام حسینؑ نے دشمن کے سامنے یہ اشعار پڑھ کر یہ قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ کامیابی آپ ہی کا حصہ ہے اور آپ کی جدوجہد نتیجہ خیز رہے گی۔

فَإِنْ نَهَضُوا فَهَذَا مَوْنٌ قَدَمًا
وَإِنْ نَعَلَبُوا فَخَيْرٌ مَعَلْبِينَا

اگر ہم شکست دیں تو یہ ہماری پرانی عادت ہے۔ ہم ہمیشہ سے اپنے دشمنوں کا سر کچلتے آتے ہیں لیکن اگر ہم شکست کھا جائیں، قتل ہو جائیں اور بظاہر فتح تمہاری

ہو جائے، جب بھی ہماری شکست نہیں ہوگی اور ہم مغلوب
 نہیں ہوں گے، ہم ماریں یا مارے جائیں، ہر حال میں
 جیت ہماری ہی ہے۔

وَمَا إِنْ طَبْنَا جُبْنَ وَوَلَكِنْ
 مَنَا يَانَا وَدَوْلَةَ أَخْرَجْنَا

ہم ڈرپوک اور بڑوں نہیں ہیں، ہم دنیا کے بہادر
 سردار ہیں۔ اگر ہم مارے جائیں تو اس لیے نہیں مارے
 جائیں گے کہ ہم ڈرپوک تھے، بلکہ اس لیے مارے جائیں
 گے کہ ہماری قضا آگئی تھی اور روزِ شہادت آپہنچا تھا۔

إِذَا مَا الْمَوْتُ رَقَعَ عَنْ أَنَا
 بِكَلَالَةِ أَنَاخِ بِأَخْرَجْنَا

زمانے کا دستور یہی ہے۔ موت کبھی ایک پر حملہ
 کرتی ہے کبھی دوسرے پر۔ مطلب یہ کہ آج ہم موت
 کی لپیٹ میں ہیں کل ہمارے دشمن ہوں گے۔

فَأَفَنِي ذَالِكُمْ سُرُوءَ قَوْمِي
 كَمَا أَفَنِي الْقُرُونِ الْأُولَى لَيْنَا

موت نے جس طرح اگلی نسلوں کو اپنی آغوش میں لے لیا
 اسی طرح آج ہمیں اور ہمارے ساتھیوں کو اپنی آغوش میں لے لے گی۔

اس کے بعد ایک عجیب غیر معمولی شعر ہے۔

فَلَوْ خَلَدَ الْمَلُوكُ إِذَا خَلَدْنَا
 وَلَوْ بَقِيَ الْكِرَامُ إِذَا بَقِينَا

”اگر شاہانِ عالم ہمیشہ زندہ رہا کرتے تو ہم بھی ہمیشہ
 زندہ رہتے، کیونکہ ہم ملک و ملکوت کے بادشاہ ہیں اور
 اگر شرفاء اور معزز ترین اشخاص کو حیات جاودانی ملا کرتی
 تو سب سے پہلے ہمیں ملتی۔“

غرض امام حسینؑ ہر مرحلے میں نتیجے کی طرف سے پوری طرح مطمئن
 تھے۔ میں اپنی معروضات کے آخر میں ایک اور نکتے پر توجہ دلانا ضروری
 سمجھتا ہوں :

میں نے جو کچھ بیان کیا ہے یا کسی اور جگہ پر جو کچھ بیان ہوا ہے
 شاید اس سے بعض لوگ یہ نتیجہ اخذ کریں کہ سید الشہداءؑ کا قیام اور ان
 کی تحریک ہی اسلام میں واحد مقدس اور مسلح تحریک ہے اور ابد تک
 اب اس طرح کی کسی اور جدوجہد کی گنجائش نہیں۔ بات یوں نہیں ہے۔
 امام حسینؑ کی تحریک سے پہلے بھی اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں اور بعد میں
 بھی اور آئندہ بھی ملتی رہیں گی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، سید الشہداءؑ کی ذات مقدس اسلامی
 تحریکوں کا مرکزی نقطہ ہے۔ امام حسینؑ کے قیام نے اپنے سے پیشتر کی
 تحریکوں کی تائید کی اور آئندہ کے لیے ایک مثال قائم کر دی۔

اگر امام حسینؑ کے قیام کی کوئی یہ تشریح کرے کہ آپ کے قیام نے
 ملت اسلامیہ کو ہمیشہ کے لیے ہر تحریک اور جدوجہد سے بری الذمہ کر دیا
 ہے اور اب صرف آپ کی نوں پشت میں امام جہدی ہی کسی دن آکر
 ایسی تحریک چلائیں گے، باقی دنیا کے مسلمانوں کو بے فکری ہو گئی اور اب
 ان کا کوئی فرض نہیں رہا تو یہ محض خیالِ خام ہے۔ اس طرح کی سوچ

درحقیقت امام حسینؑ کے مقصد اور ان کے ہدف کے بالکل برعکس ہے۔
میں نے آٹھویں کی شب میں کہا تھا کہ عثمانی دورِ خلافت کے نصفِ
دوم میں مسلمان اسلامی حکومت کے صحیح راستے سے بہت دُور ہٹ گئے
تھے، وہیں سے قیام کی ابتدا بھی ہو گئی تھی۔

میں نے اپنی گفتگو کا عنوان رکھا تھا: ”وہ اسباب جنہوں نے
امام حسینؑ کو قیام پر مجبور کیا“ یا ”امام حسینؑ کے قیام کے محرکات“
اس لیے یہ نامناسب ہوگا اگر میں اس کی وضاحت نہ کروں کہ جس مقصد
سے امام حسینؑ نے قیام کیا اور تحریک چلائی اسی مقصد سے ان سے پیشتر
اسلامی تاریخ میں کچھ اور بزرگ ہستیوں بھی جدوجہد کرتی رہی تھیں اور
امام حسینؑ کے بعد بھی یہ جدوجہد جاری رہی۔ اگر لوگ جدوجہد کے ان
واقعات کی قدر و قیمت نہیں سمجھتے یا نہیں سمجھ سکتے تو اس کی وجہ ان کی
نادانفیت یا نادانی ہے۔ عُدُّوْهُمْ جَعَلَهُمْ۔

ابوذر غفاریؓ غیر معمولی شخصیت کے آدمی تھے، انہوں نے جوں ہی
محسوس کیا کہ حکومت کا نظام اپنی ڈگر سے ہٹ گیا ہے وہ بڑھاپے کے باوجود
اس کی مخالفت میں سرگرم ہو گئے، سخت مخالفت کی، تند و تیز نکتہ چینی کی،
تقریریں کیں، خاتم الانبیاءؐ کی حدیثیں سنائیں، عثمان کی موجودگی میں اور
ان کی پیٹھ پیچھے کوچہ و بازار میں اعتراضات کیے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاریخی
لحاظ سے اس تمام جدوجہد اور تحریکوں کے بانی صحابی رسولؐ ابوذرؓ ہی تھے
چنانچہ شہر بدر کیے گئے، تکلیفیں اٹھائیں، آخر وطن سے دُور بے کسی کے عالم
میں رتہ کے مقام پر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

ابوذر اور عثمان کے بعد امیر المؤمنینؑ شہید ہو گئے اور معاویہؓ بڑھاپے سے

آئے تو لوگوں نے پھر وہ سلسلہ شروع کر دیا۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے تو ان کی
 جگہ حجر بن عدی کنڈی رضی اللہ عنہ لے لی۔ ابوذر رضی اللہ عنہ تو اکیلے تھے۔ حجر کے ساتھ تیرہ
 اور دوسرے ممتاز مسلمانوں نے معاویہ بن ابی سفیان کی کجروی کے خلاف
 آواز بلند کی، ان چودہ اشخاص کو زنجیروں میں باندھ کر عراق سے شام
 لے جایا گیا۔ وہاں دو آدمی تو چھوڑ دیے گئے، باقی بارہ آدمیوں کو مَرَجُ الْغَنَازِ
 نامی مقام پر لے جایا گیا، وہاں چھ آدمیوں کی گردن مار دی گئی۔ چار آدمیوں
 کو کسی نہ کسی سفارش پر رہائی ملی۔ دو نے کہا کہ ہمیں معاویہ کے پاس
 لے چلو تاکہ ہم وہاں جا کر باقاعدہ توبہ کر لیں، ان دونوں کو معاویہ کے
 پاس لے گئے، وہاں ایک تو معافی مانگ کر چھوٹ گیا مگر دوسرے نے
 معاویہ کے سامنے معاویہ پر اور بھی سخت نکتہ چینی کی اور اعتراض کرتے
 شروع کر دیے۔ معاویہ نے کہا: یہ تو سب سے خراب شخص ہے اسے یہاں
 کیوں لے آئے ہو؟ ساتھ ہی عراق کے گورنر زیاد بن ابیہ کو خط لکھا۔
 ان صاحب کا نام عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ حَسَّانِ عَنزَمِي تھا۔ معاویہ نے ان
 کو عراق بھیجا دیا اور ابن زیاد کو لکھا: "أَقْتُلْهُ شَرَّ قَتْلَةٍ" اس شخص
 کو بدترین طریقے سے قتل کر دو۔" جب معاویہ کا فرمان ابن زیاد کے پاس
 پہنچا، اس نے کہا کہ "امیر المومنین نے مجھے حکم دیا ہے کہ تجھے بدترین طریقے
 سے قتل کر دوں، میرے خیال میں بدترین طریقہ قتل کا یہ ہے کہ تجھے قبر
 کھود کر اُس میں زندہ دفن کر دوں۔" ان بزرگ کا شمار شہدائے اسلام
 میں ہے، یہ امیر المومنینؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ ان کا گناہ فقط اتنا
 تھا کہ یہ اُس وقت کی رسولؐ کے زمانہ صورتِ حال پر نکتہ چینی کرتے تھے
 لہذا قبر کھود کر ان کو زندہ درگور کر دیا گیا اور اوپر سے مٹی پاٹی دی گئی

یہ کوئی افسانہ نہیں ہے، کامل ابن اثیر اور دوسری مستند کتابوں میں یہ قصہ دیکھا جاسکتا ہے۔

جب سید الشہداءؑ کا زمانہ آیا، آپ نے بھی اسی پچھلے طریقہ پر عمل کرنا شروع کیا۔ آخر میں البتہ آپ کی جدوجہد نے وہ خاص اچھوتا رُخ اختیار کیا جو آپ کے حالات کے اعتبار سے موزوں اور خود آپ کے شایان شان تھا۔ چنانچہ آپ خود اور آپ کے اقربا شہید ہوئے اور کئی لحاظ سے آپ کے قیام نے اسلامی تاریخ کی تمام اگلی پچھلی مقدس تحریکوں میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ اس منبر سے اس قابل صدا احترام مجلس میں جب میں قیام، جدوجہد اور تحریک کی بات کرتا ہوں تو اس سے مراد طرح کی افرتغزی اور بد نظمی پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ صرف وہ مقدس تحریکیں مراد ہیں جو اسلام کی تاریخ میں لائق اور محترم شخصیتوں نے صورتِ حال کے صحیح اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کے بعد مسلمانوں کی بہتری اور اصلاح احوال کے لیے چلائیں۔ امام حسینؑ نے قیام اور تحریک کا دفتر بند کر کے اس پر ٹھہر نہیں، لگا دی ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ جس طرح امام حسینؑ نے یزید کے خلاف قیام کیا اسی طرح امام حسینؑ کے پوتے زید بن علی نے ہشام بن عبد الملک کے خلاف قیام کیا۔ زید بن علی قتل ہوئے، ان کے جسم کو سولی پر لٹکایا گیا۔ اگرچہ ان کے حامیوں نے راتوں رات ان کی لاش کو دفن کر دیا تھا اور ان کی قبر کو زیر آب کر دیا تھا، مگر جاسوسوں نے دشمن کو اطلاع دے دی چنانچہ اگلے دن ان کی قبر کھود کر لاش نکال لی گئی اور اس کو برہنہ کر کے اس جگہ

سُولی پر لٹکا دیا گیا جہاں گونہ میں شہر کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ چار سال تک زید بن علی کی لاش اسی طرح سُولی پر لٹکتی رہی۔ وہ لوگ یہ سمجھتے رہے کہ زید بن علی کے جسم کے سُولی پر لٹکتے رہنے میں ہشام بن عبد الملک کا فائدہ ہے اور آل محمد کا نقصان، لیکن تاریخ نے قطعی فیصلہ کر دیا کہ اس سارے قضیے میں صرف حق اور اہل حق کا ہی فائدہ تھا۔

زید بن علی کے بعد ان کے صاحبزادے یحییٰ بن زید نے قیام کیا ان کی لاش سات سال تک سُولی پر لٹکتی رہی۔

تاریخ اسلام کے وہ قیام جو عرصہ دراز تک اُموی اور عبّاسی خلافتوں کے دوران میں ہوتے رہے اور جن کی ابتداء ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہوئی، ان کے علم بردار ایک دن حجر بن عدی تھے۔ ایک دن حسین بن علیؑ جو تمام مقدّس تحریکوں کا مرکز بن گئے۔ ایک دن زید بن علیؑ۔ ایک دن یحییٰ بن زید۔ ایک دن حسین بن علی بن الحسن بن علی بن ابی طالبؑ تھے جو شہدائے فخر کے رہنما تھے۔ اسی طرح ایک دن موسیٰ بن جعفرؑ اور ایک دن کچھ دوسرے۔ اگر کوئی ان تحریکوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کو سمجھنا اور جاننا نہیں چاہتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں کچھ شرعی قباحتیں بھی بیان کرتا ہے تو ایسے شخص کے متعلق بڑے افسوس کے ساتھ یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ مسخرہ ہے۔

زید بن علی کا فعل اور ان کا قیام شرعی تھا یا نہیں؟ یحییٰ بن زید نے جو قیام کیا تھا وہ شریعت کے مطابق تھا یا نہیں؟ اس کے متعلق اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ زید بن علی کے قیام کو امام صادقؑ نے درست قرار دیا تھا اور اس کی توثیق کی تھی۔ ان کی شہادت کے بعد امام صادقؑ نے فرمایا

تھا کہ

”میرے چچا زید بن علی نے بھی وہی راستا اختیار کیا
جو شہدائے بڈر نے زمانہ رسالت میں اختیار کیا تھا،
ہدف سب کا ایک ہی تھا، جو مقصد شہدائے بڈر کا تھا
وہی زید بن علی کا تھا۔“

اب نص کے مقابلے میں تو کوئی اجتہاد صحیح نہیں ہو سکتا اور کسے
ملّت کے لیے سرفروشی اور قیام کی سخت ضرورت کے بارے میں بے خبری
درست ہو سکتی ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ عَذْبُہُمْ
جَہَنَّمُ۔ (بے چارے ناواقفیت کی وجہ سے معذور ہیں)۔

بندہ نے اسلامی تاریخ کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے باقی اقوام کی
تاریخ کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا اس لیے میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا
یاں اجمال طور پر اس میں شبہ نہیں کہ نہ صرف مسلمانان عالم بلکہ عیسائی،
یہودی اور جو بھی قوم دنیا میں زندہ موجود ہے وہ اپنی جدوجہد اور مقدس
تحریکوں ہی کے طفیل زندہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسرائیلی
تاریخ میں ایک خاص صورت پیش آئی ہے۔

بیجا نہ ہوگا اگر اس موقع پر ایک اور نکتہ بھی عرض کر دوں، گو میری
آج کی تقریر سے اس کا براہ راست تعلق نہیں ہے پھر بھی اس کو نظر انداز
کرنا غلط ہوگا۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ :

آخر یہ کیا بات ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے سانحہ نے اسلامی
تاریخ کے تمام حادثات، تمام تحریکوں اور مسیح جدوجہد کے تمام واقعات میں
مرکزیت حاصل کر لی ہے؟ کسی اور قیام، تحریک اور اجتماعی شہادت

کے واقعہ نے وہ شہرت اور اہمیت حاصل نہیں کی جو واقعہ کربلا نے کی۔ یہ
ساخہ اسلامی تاریخ کے تمام المیوں سے بازمی لے گیا۔

غزوہ اُحد میں انہی افراد سے زیادہ، جہاں تک میں نے گنا ہے،
شہید ہوئے۔ یہ بڑا دردناک ساخہ تھا۔ شہدائے اُحد کے جسموں کا مُشَدِّد
کیا گیا۔ شہیدوں کے ناک، کان اور ہونٹ کاٹ لیے گئے اور ان کے
جسم اس طرح سِخ کر دیے گئے کہ بہنیں اپنے بھائیوں کی لاشیں دیکھ کر
انہیں پہچان نہیں سکتی تھیں لیکن اس کے باوجود اُحد کے ساخہ کی بھی وہ
حیثیت نہیں جو کربلا کے حادثہ فاجعہ کی ہے۔

ایک اور بڑا ساخہ یہ تھا کہ منصور دوانیقی کے حکم سے حسنی سادات
میں سے سولہ افراد کو قوف کے ہاشمی قید خانے میں بند کر دیے گئے، وہ وہیں
یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے لیکن منصور نے اس کی اجازت نہیں دی کہ ان
میں سے کسی کی لاش باہر لائی جاتے، یہاں تک کہ ایک ایک کر کے وہ سب
مر گئے۔ ان میں سے جو مرتے جاتے تھے ان کی لاشیں زندہ بچنے والوں کی
آنکھوں کے سامنے رہتی تھیں۔ جب یہ سب دُنیا سے کوچ کر گئے تو منصور
نے حکم دیا کہ قید خانے کی چھت ان سولہ شہداء اور فرزند ان رسولِ خدا پر
گرا دی جائے۔ ان کو نہ غسل دیا گیا اور نہ کفن، نہ کسی کو سپردِ خاک ہی کیا گیا۔
اس فاجعہ کی حیثیت بھی ساخہ کربلا کی سی نہیں:

لَا يَوْمَ كَيَوْمِكَ يَا أَبَا عَبْدِ اللَّهِ!

لے ابو عبداللہ! آپ کے واقعہ کی تو کوئی نظیر ہی نہیں۔

بالکل صحیح اور مستند بات ہے قطعاً یہی صورت ہے، لیکن یہ صورت
کیوں ہے؟ اس کے جواب میں، گو میری تقریر کا وقت ختم ہو گیا ہے، اتنا

ضرور عرض کروں گا کہ یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ سید الشہداءؑ کی تحریک
 اور ان کے قیام کی برتری کا ایک نہایت اہم سبب وہ واقعات ہیں جو امام
 حسینؑ اور آپ کے اصحاب کی شہادت کے فوراً بعد پیش آئے۔ اس قیام
 کو ایک طرف تو اسیران اہل بیت کی بدولت شہرت ملی اور دوسری طرف خود
 قاتلانِ حسینؑ نے اس کو شہرت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ امام کی شہادت
 کے بعد اور معرکے کے ختم ہو جانے پر دشمنوں نے کیننگی میں کوئی کسر نہیں
 اٹھا رکھی، شہداء کے جسم کے ٹکڑے کر دیے، ان کے کپڑے ٹوٹ لیے،
 خیموں کو ٹوٹا اور آگ لگائی، شہیدوں کے بدن گھوڑوں کے سمنوں تلے
 روندے، ان کے سروں کو نیزوں پر چڑھایا، غم نصیب قیدیوں کے ساتھ سختی
 کا برتاؤ کیا، ان کے خشک ہونٹوں پر لکڑیاں ماریں۔ یہ بے ہودگیاں کر بلا
 سے شروع ہوئیں اور شام تک جاری رہیں۔ یزید نے ذاتی طور پر ان ہودگو
 میں حصہ لیا لیکن اسیران اہل بیت جہاں بھی گئے انھوں نے ایسے وقار
 اور متانت کے ساتھ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا، اپنی کامیابی اور دشمن کی
 رسوائی کا تذکرہ کیا۔ ایسے وقت میں جب کہ سب لوگ انھیں شکست خوردہ
 اور دشمن کو کامیاب تصور کر رہے تھے، انھوں نے یہ جتلا دیا کہ دراصل
 کامیاب و کامران تو وہ ہوئے ہیں اور مغرور دشمن کے حصے میں تو صفا
 رسوائی آئی ہے۔

امام زین العابدینؑ نے شہر کوفہ کے مضافات میں — اور زینبؑ
 اُمّ کلثومؑ اور فاطمہ بنتِ احسینؑ نے کوفہ کے بازاروں میں تقریریں کیں
 اور عام لوگوں کی توقع اور اندازے کے برعکس بنی اُمیہ کی حکومت کے
 زوال کا اعلان کیا۔

زینب کبریٰؑ نے ایک اور موقع پر یزید کے دربار میں تقریر کی، اور واضح الفاظ میں تین بار اُس کی تکفیر کی۔ امام زین العابدینؑ نے دمشق میں خطبہ دیا جس میں اچھی طرح اپنا تعارف کرایا اور یزید کے لیے مشکلات پیدا کر دیں۔ جب امام عابدؑ ایک قیدی کی حیثیت سے دمشق کے بازار میں تھے، ابراہیم بن طلحہ بن عبید اللہ نے ان کے پاس آکر چرطنے کے لیے کہا: علی بن الحسینؑ کو جو جیت کس کی ہوتی؟ امام عابدؑ نے اس کے جواب میں کہا: جب نماز کا وقت ہو جائے تو اذان دینا اور اقامت کہنا، اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ جیت کس کی ہوتی۔ یعنی گو تیرا تعلق خاندانِ تیم سے ہے اور تو بنی ہاشم کا دشمن ہے پھر بھی جب تک تو اسلام کو چھوڑ ہی نہ لے، اذان اور اقامت میں یہی کہے گا کہ اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ فِرْزَانِ مُحَمَّدٍ ہم ہیں نہ کوئی اور۔ جب تک اسلام کا نام قائم ہے ہم آل محمدؑ کی عورت بھی برقرار ہے گی اس میں فرق نہیں آسکتا۔

مجھے تو یقین ہے کہ اگر ابن سعد اور ابن زیاد، خواہ خود غرضی ہی سے سہی، امام حسینؑ اور آپ کی شہادت کے بعد اہل بیت کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آتے، شہداء کی تدفین میں ممانع نہ ہوتے، اہل بیت کو کربلا ہی سے براہ راست مدینہ بھجوا دیتے اور دربارِ خلافت کی بیہودگیوں اور اہل بیت کے اپنے حق میں موثر پروپیگنڈے کے واقعات پیش نہ لاتے تو امام حسینؑ اور ان کے بزرگ رفقاء کی شہادت کی یہ تصویر جو دنیا میں ابھری وہ نہ ابھرتی اور ان کے دشمن اس طرح ذلیل و رسوا نہ ہوتے۔

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

خطبہ اور منبر

①

أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
 بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 الرَّحْمَنُ. عَلَّمَ الْقُرْآنَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ.
 عَلَّمَهُ الْبَيَانَ.

آج کی گفتگو کا موضوع ہے ”خطبہ اور منبر“۔ چونکہ خطبہ کے معنی بھی تقریر ہیں، اس لیے اس تقریر کا موضوع تقریر ہے یعنی یہ آپ اپنا موضوع ہے۔ تقریر کرنے کو علمی زبان میں خطابت کہتے ہیں۔ منطقیوں نے کلام کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں جن کو صناعات خمسہ یعنی پانچ ہنر کہا جاتا ہے، ان ہی میں سے ایک ”خطابت“ ہے۔ یہ تقسیم ارسطو کی قائم کی ہوئی ہے۔

اس وقت موقع نہیں کہ خطابت کی تاریخ بیان کی جائے یا خطابت

کی فنی اقسام کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر گفتگو کی جائے۔ بعض منطقیوں نے خاص طور پر اس کی خوب تفصیل بیان کی ہے۔ اگر ہم صرف اس تفصیل کو پیش نظر رکھیں جو بوعلی سینا کی کتاب سِفَا میں بیان کی گئی ہے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، مگر ان باتوں پر بحث مقصود نہیں کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ صرف نظری پہلو سے گفتگو نہ کی جائے۔

چونکہ ہماری گفتگو کا موضوع ہے خطبہ اور منبر اور منبر سے مراد ہے ”دینی موضوعات پر تقریر“۔ اس لیے ہماری آج کی گفتگو ”دینی خطابت“ کے بارے میں ہے، خطابت اور کلام کی دوسری اقسام سے عرض نہیں۔ آج میں اسلام سے خطابت کے تعلق پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں! خطابت کا اسلام سے تعلق کئی پہلو سے ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خطابت ایک فن اور ایک ہنر ہے اور کسی بھی فن یا صنعت کو کسی نظر سے یا عقیدے کی تقویت کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور اسے کمزور کرنے کے لیے بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ فن اور صنعت میں کیا فرق ہے۔

اگر آپ اصفہان میں مسجد شاہ جایتی اور گنبد شیخ لطف اللہ کو دیکھیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ کس طرح علم و ہنر اور صنعت نے دین کی اعانت کی ہے یعنی مذہبی احساسات اور ذوق ہنر نے کس طرح ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے اور ایک مذہبی شعار نے کس طرح ہنر اور صنعت کا روپ دھارا ہے۔

خطاطی بھی ایک ہنر ہے۔ نفیس قرآنی کتب، مثلاً وہ کتبہ جو مقصود مشہد کے ایوان میں بایسنقر نے لکھا ہے، یہ ظاہر کرتے ہیں کہ

ہنر اور صنعت کس طرح مذہبی احساسات کی تقویت کا باعث بن سکتے ہیں۔ خطابت بھی چونکہ ایک ہنر اور فن ہے اور ہنر اور فن معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کا شمار معاشرتی عوامل میں ہوتا ہے اس لیے خطابت بھی معاشرتی عوامل میں سے ایک ہے بلکہ اس کا جتنا اثر معاشرے پر ہوتا ہے کسی اور فن کا نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے اگر آپ فن خطابت پر نظر ڈالیں گے تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ اس فن کا تعلق بھی اسلام سے ایسا ہی ہے جیسا اور بہت سے فنون کا۔

جس طرح اسلام میں سنگ تراش پیدا ہوئے اور سنگ تراشی نے ترقی کی، آئینہ بند پیدا ہونے اور آئینہ بندی نے ترقی کی، گل کار پیدا ہونے اور چکی کاری اور گل کاری نے ترقی کی، اسی طرح اسلام نے اپنے دامانِ عاطفت میں بڑے بڑے خطیبوں کی پرورش بھی کی ہے۔ بہت سے تو خطیب ہی کے نام سے مشہور ہو گئے۔

آپ دیکھیں گے کہ اسمائے رجال اور تراجم کی کتابوں میں متعدد ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے خطیب کے نام سے شہرت پائی ہے۔ ایک صاحب خطیب رازمی تھے۔ دوسرے خطیب مصری۔ ایک خطیب دمشقی کہلاتے تھے۔ ایک خطیب تبریزی۔ ایک خطیب حصفلی۔ یہ سب وہ لوگ تھے جن کی ان کے اور مابعد کے زمانے میں بحیثیت خطیب کے شہرت ہوئی۔ خوش قسمتی سے آج بھی ہمارے یہاں بڑے بڑے مذہبی خطیب موجود ہیں۔ مرحوم سید جمال الدین افغانی علاوہ اور خوبیوں کے ایک زبردست خطیب بھی تھے۔ انہوں نے مصر میں اپنے خطبوں کے ذریعے سے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ وہ لوگوں کو رلاتے تھے، ان کی اپنی حالت پر کسی اور

چیز پر نہیں۔ اسلام نے اپنے دامن میں بڑے خطیبوں کی پرورش کی ہے اس کی بھی اپنی تاریخ ہے۔ میں صرف اس قدر اشارہ کرنا چاہتا تھا، یہاں تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔

بہر حال اس نقطہ نگاہ سے خطابت کا بھی اسلام سے وہی تعلق ہے جو دوسرے فنون کا۔ اسلام نے مختلف اقسام کے ہنرمند اور صنّاع پیدا کیے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک طبقہ خطیبوں اور شاعروں کا بھی ہے۔ خطابت کی پیش رفت اور ترقی پر اسلام نے براہ راست جو اثر ڈالا ہے وہ خطابت اور اسلام کے تعلق کا ایک دوسرا رخ ہے۔ اسلام نے نہ صرف فن خطابت کو متاثر کیا بلکہ اسے ایک بلند مقام بھی عطا کیا۔

جن فنون کا تعلق زبان سے ہے یعنی شعر گوئی، تحریر اور تقریر ان میں سے عربوں کو شعر گوئی میں کافی کمال حاصل تھا۔ عرب قطری طور پر شاعر ہیں۔ قبل از اسلام بھی ان میں ممتاز شعراء موجود تھے، گو وہ اپنی محدود معلومات کی وجہ سے محدود خیالات ہی کا اظہار اپنے اشعار میں کر سکتے تھے۔ پھر بھی جن افکار تک ان کی رسائی تھی ان کی حدود میں رہتے ہوئے وہ بہت عمدہ شعر کہتے تھے لیکن خطابت کے میدان میں عربوں کو وہ کمال حاصل نہیں تھا۔ باوجود اس کے کہ زمانہ جاہلیت کے اشعار کا کافی ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے، خطابت کے بہت کم نمونے ملتے ہیں، پھر بھی کچھ نمونے موجود ہیں۔ تیسرے فن یعنی تحریر کا کوئی نمونہ موجود نہیں، زمانہ جاہلیت کی کوئی تصنیف ہمارے پاس نہیں جو اس زمانے کے طرزِ تحریر کی یادگار ہو۔

اسلام نے آکر تینوں فنون کو متاثر کیا۔ شعر کے معانی میں وسعت

پیدا ہو گئی۔ اگر زمانہ اسلام کے اشعار کا موازنہ زمانہ جاہلیت کے اشعار سے کیا جائے تو خیالات میں وسعت کے لحاظ سے نمایاں فرق محسوس ہوگا۔ خطابات میں اسلام نے انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اسلام ہی کی بدولت تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا۔

ایک کتاب ہے جس کا نام جمرہ مخطب العرب ہے، اس مجموعہ میں زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں آذوار کے وہ خطبے شامل ہیں جو عربوں نے دیے۔ اگر آپ ان خطبوں پر نگاہ ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ خیالات کے لحاظ سے بہت سادہ اور سطحی ہیں لیکن جب آپ اسلامی دور کے خطبے دیکھیں گے تو آپ کو ایک انقلاب محسوس ہوگا۔

زمانہ جاہلیت کے خطبوں میں سے کچھ فقرے اکتھم بن صفی اور مشہور عرب خطیب قس بن ساعدہ آیادی کے نقل ہوئے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ بہت سادہ اور سطحی ہیں۔ جیسے ہی آپ اسلامی دور میں داخل ہوں گے اور آپ کی نظر رسولِ اکرم ص کے خطبوں پر پڑے گی تو آپ کو ایک اور ہی انداز نظر آئے گا، ان میں خیالات مختلف ہیں مثلاً کا بیان ہے، روحانیت ہے، اجتماعی اور اخلاقی مسائل ہیں، عقل و دانش ہے۔ جب کہ زمانہ جاہلیت کے خطبوں میں ان سب باتوں کا وجود نہیں تھا۔ اسلام نے زبان سے متعلق تینوں فنون کو متاثر کیا ہے۔ قرآن مجید خود اعجازِ بیان اور فصاحتِ لسان کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور بیان کو اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت قرار دیتا ہے :

الرَّحْمَنُ . عَلَّمَ الْقُرْآنَ . خَلَقَ الْإِنْسَانَ .
عَلَّمَهُ الْبَيَانَ .

پیغمبر اسلام پر سب سے پہلے جو آیات نازل ہوئیں، ان میں قلم اور تحریر کا ذکر ہے:

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ.

اس تعلیم کے نتیجے میں نہ صرف فنِ خطابت میں انقلاب آیا بلکہ فنِ کتابت کو بھی رواج حاصل ہوا۔ یہ بات بلا سبب نہیں تھی کہ مسلمانوں نے زبان سے متعلق علوم اور علمِ فصاحت و بلاغت کے قواعد ایجاد کیے۔

اس کے علاوہ خود رسول اکرمؐ اور امیر المؤمنینؑ اولین خطیب مانے جاتے ہیں۔ اس وقت موقع نہیں کہ میں ان حضرات کی تقریروں کے کچھ اقتباسات سناؤں اور ان کا موازنہ جاہل عربوں کی تقریروں کے فقروں سے کروں۔

جس نکتہ کے متعلق میں آج گفتگو کرنا چاہتا ہوں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اور خطابت کے درمیان ایک بہت مضبوط رشتہ ہے اور وہ رشتہ یہ ہے کہ ایک خاص موقع پر خطابت کو دین کا جزو قرار دیا گیا ہے۔ اگر آپ سے سوال کیا جائے تو کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ وہ کون سا موقع ہے؟

جی ہاں ایک موقع ایسا ہے کہ خطابت بھی اسی طرح فرائض میں داخل ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکات، خمس وغیرہ، وہ موقع نماز جمعہ کا ہے۔

اسلام میں ایک ہفتہ وار نماز ہے جس کا نام نماز جمعہ ہے۔ خود

قرآن مجید کی سورۃ جمعہ میں اس نماز کا خصوصی تذکرہ ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ
الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ .
ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ .

شیعہ اور سُنی تمام مُفسّرین کا اتفاق ہے کہ یہاں ذِکر سے مُراد

نماز جمعہ ہے۔

نماز جمعہ کیا ہے ؟ وہ ظہر کی نماز جو جمعہ کے دن پڑھی جاتی ہے، لیکن یہ نماز اور نمازوں سے مختلف ہے۔ پہلے تو یہ کہ ہر روز نماز ظہر کی چار رکعتیں ہوتی ہیں لیکن نماز جمعہ کی صرف دو۔ رہی اس کی وجہ کہ نماز جمعہ صرف دو رکعت کیوں ہے، یہ بعد میں عرض کروں گا، بہر حال نماز جمعہ دو رکعت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس نماز کو جماعت سے پڑھنا واجب ہے، باقی نمازوں یعنی نماز فجر، نماز ظہر، نماز عصر، اور مغرب و عشاء کا جماعت سے پڑھنا واجب نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جہاں نماز جمعہ ہوتی ہے اس کے ہر چار جانب دو فرسخ تک کے لوگوں پر واجب ہے کہ اس نماز میں شرکت کریں سوائے اس کے کہ کسی عُذر کی وجہ سے ایسا نہ کر سکیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ جس جگہ نماز جمعہ کا اہتمام ہو اس کے ایک فرسخ تک حرام ہے کہ کسی دوسری جگہ نماز جمعہ قائم کی جائے۔ صرف وہی ایک نماز ہونی چاہیے۔

اب دیکھیے کہ اگر واقعی ایسی نماز ہونے لگے تو وہ کیسی نماز ہوگی!

مثلاً تہران میں جس جگہ ہم اس وقت اکٹھے ہیں اگر وہاں نماز جمعہ تشکیل دی جائے اور یہاں سے شمال میں شہیران تک اور جنوب میں شہرے تک اور اسی طرح مشرق اور مغرب میں بارہ کیلومیٹر کے فاصلے تک لوگ، کیونکہ دو فرسخ شرعی کے بارہ کیلومیٹر بنتے ہیں، اس نماز میں شرکت کریں اور چھ کیلومیٹر کے فاصلے تک کسی اور جگہ نماز جمعہ نہ ہو تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ کس قدر عظیم اجتماع ہوگا۔

نماز جمعہ چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھی جاتی ہے کیونکہ بکثرت احادیث و اخبار میں آیا ہے اور یہ مسلمات میں سے ہے کہ
 اِنَّمَا جُعِلَتِ الْجُمُعَةُ رَكَعَتَيْنِ لِمَكَانِ
 الْخُطْبَتَيْنِ .

یعنی اس نماز میں جو یکجا ادا کی جاتی ہے فرض ہے کہ دو خطبے پڑھے جائیں اور یہی دو خطبے دو رکعت کے قائم مقام ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو میں نے عرض کی تھی کہ خود دین اسلام میں ایک موقع ایسا ہے کہ جہاں تقریر یا خطبہ جزو دین ہے، جزو نماز ہے۔ امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ
 ”خطبہ خود نماز ہے“

لہذا جب تک امام جمعہ و جماعت خطبہ پڑھتا ہے اور منبر سے نیچے نہ اترے لوگوں کو خاموشی سے اس کی طرف متوجہ ہو کر خطبہ سنانا چاہیے گویا کہ وہ حالت نماز میں ہیں۔ البتہ کچھ فرق بھی ہیں، مثلاً قبلہ رو ہو کر بیٹھنا یا خود امام کا جب وہ خطبہ پڑھ رہا ہو قبلہ رو ہونا واجب نہیں ہے

بہر حال اس موقع پر جو دو خطبے فرض ہیں وہ نماز ظہر کی
دو رکعتوں کی جگہ پر ہیں۔

آپ ان اسلامی احکام پر جو آپ نے پہلے نہیں سُنے یا بہت کم
سُنے ہیں تعجب کریں گے اور پوچھیں گے کہ جمعہ کے اس اجتماع اور اس
کے ان سب آداب کا مقصد کیا ہے؟ آپ کو اور زیادہ تعجب ہو گا جب
آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ اس اجتماع کا بڑا مقصد ان ہی خطبوں کا سننا ہے
اس سے سمجھ لیجیے کہ یہ خطبے کس قدر اہم اور کیسے ضروری ہیں۔ ان کی اس
قدر اہمیت ہے کہ جیسے ہی مؤذن تکبیر کی صدا بلند کرے، جو شخص جہاں
بھی ہو اور جو کام بھی کر رہا ہو، اس کام کو چھوڑ کر نماز جمعہ کے لیے نکلے
اور پہلے ان دونوں خطبوں کو سُنے اور پھر دو رکعت نماز باجماعت پڑھے،
اس کے بعد وہ آزاد ہے۔ سورۃ جمعہ میں اس کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ
يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ
ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ .
فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ .

یہ بھی بتانا چلوں کہ ظہر کی نماز میں پہلے ظہر کے وقت اذان ہوتی
ہے اور پھر نماز پڑھی جاتی ہے لیکن جمعہ کے دن اگر نماز جمعہ پڑھنی ہو
تو اذان، ظہر کے وقت سے پہلے دی جاتی ہے، ہونا یہ چاہیے کہ اذان
اس طرح دی جائے کہ زوال آفتاب شروع ہونے تک دونوں خطبے پورے
ہو جائیں۔

جیسے ہی نمازِ جمعہ کے لیے مُؤذن کی صدا بلند ہو اس کے بعد خرید و فروخت حرام ہے۔ نَصُّ قَرآنی ہے وَذَرُوا النَّبِیْعَ۔ یہ اسلام کے مُسَلِّمات میں سے ہے۔ اس بارے میں شیعہ سُنی کا کوئی اختلاف نہیں کہ اگر کہیں صحیح طریقے سے جمعہ کی نماز ہوتی ہو اور اذان ہو جائے تو مثلاً: اگر کوئی دکاندار ترازو کے پاس بیٹھا یا کھڑا ہے اور گاہک مثلاً اس سے پنیر خرید رہا ہے اور وہ چھڑی لیے ہوئے پنیر کاٹ رہا ہے تو جیسے ہی اللہ اکبر کی آواز بلند ہو، دکاندار اور گاہک دونوں پر واجب ہے کہ ہاتھ روک لیں اور نماز کے لیے لپکیں :

فَاسْتَعِزُّوا إِلَى اللَّهِ وَذَرُوا النَّبِیْعَ .

یعنی دوڑو نماز کی طرف اور چھوڑ دو خرید و فروخت۔

اس وقت خرید و فروخت حرام ہے۔ لوگوں کے لیے ضروری ہے

کہ فوراً جا کر خطبہ سُنیں۔

جمعہ کی نماز میں ایک نہیں دو خطبے ہوتے ہیں۔ اس طرح کہ امام ایک خطبہ پڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور ذرا سی دیر خاموش ہونے کے بعد پھر اُٹھ کر دوسرا خطبہ پڑھتا ہے۔

یہ تو معلوم ہو گیا کہ جمعہ کے خطبہ کی کتنی اہمیت ہے کہ اس اجتماع کا خاص مقصد ہی ان خطبوں کو سُنانا ہے۔ رہی یہ بات کہ ان خطبوں یا تقریروں میں کیا کہا جاتے ؟ تو اس کی صورت یہ ہے کہ اول حمد و ثنائے الہی، اس کے بعد خاتم الانبیاءؑ اور آئمہ دین پر درود و سلام پھر وعظ اور وہ ضروری مضامین جن کی تشریح میں بعد میں کروں گا۔ اور اس کے بعد قرآن کی ایک سورت کی تلاوت۔ یہ وہ مواد ہے جو اسلام

نے تجویز کیا ہے۔

یہ سمجھنے کے لیے کہ اس اجتماع میں حاضری کس قدر اہم ہے اس روایت پر غور کیجیے جس کے مطابق :

یہ واجب ہے کہ قیدیوں کو بھی پولیس اور جیل کے اہل کار اپنے ساتھ لائیں اور انھیں اس ہفتہ وار عام اجتماع میں شرکت کا موقع دیں۔ قیدیوں کو اپنے ساتھ حراست میں لائیں اور ان کو نگرانی میں رکھیں تاکہ انھیں فرار کا موقع نہ مل سکے۔ یعنی یہ ضروری ہے کہ قیدی کو جیل سے باہر لایا جائے تاکہ وہ نماز جمعہ، جماعت کے ساتھ ادا کرے خطبہ سُنے اور پھر اپنی جگہ چلا جائے۔

امام جمعہ و جماعت کے لیے بھی کچھ آداب مقرر ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ سر پر عمامہ باندھے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی مختصر سی شمال وغیرہ جس کے دو تین تزیین ہوں، سر پر رسول اللہ کے عمامہ کی طرح لپیٹ لے۔

اللہ، جناب حاجی رحیم ارباب اصفہانی کو زندہ و سلامت رکھے ثناید آپ میں سے بہت سے ان کو جانتے بھی ہوں گے، وہ فقہ، اصول، فلسفہ اور قدیم ریاضیات کے بڑے علماء میں سے ہیں اور مرحوم جہانگیر خاں قشقائی کے شاگرد رہے ہیں۔ مرحوم جہانگیر خاں ہی کی طرح وہ ابھی تک کھال کی ٹوپی اور ہتھے ہیں، باقی سب لحاظ سے ان کا لباس دیگر علماء ہی کی طرح ہے، وہی عبا قبا وہی حلیہ، صرف ٹوپی کھال کی اور ہتھے ہیں۔ وہ نماز جمعہ کے بڑے معتقد ہیں اور اصفہان میں خود نماز جمعہ پڑھاتے ہیں لیکن

لوگ چونکہ عموماً نمازِ جمعہ میں دلچسپی نہیں رکھتے اس لیے جس شان سے ہونی چاہیے نہیں ہوتی۔ وہ جب جمعہ کی نماز کے لیے آتے ہیں تو ایک مختصر سا عمامہ یعنی دو تین پیچ کی ایک مثال سر پر باندھ کر آتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں فروردین ۱۳۳۹ھ میں اصفہان میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو جمعہ کی نماز کا تذکرہ آگیا۔ فرمانے لگے: معلوم نہیں کہ شیعہ کب نمازِ جمعہ کے ترک کا الزام اپنے اوپر سے دُور کریں گے۔ سب اسلامی فرقے ہم پر اعتراض کرتے ہیں اور ہمارا مذہب ہی مذاق اڑاتے ہیں کہ ہم نے جمعہ کی نماز ترک کر رکھی ہے۔ انھوں نے اس بات کی تمنا کی کہ کاش قم کی مسجد اعظمہ میں چند ملیں تو مان ترحیح کر کے (توسیع کی جائے) تاکہ یہاں شاندار طریقے سے نماز جمعہ قائم ہو کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امام کھڑے ہو کر خطبہ پڑھے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا لَفَضُوا إِلَيْهَا
وَتَرَكُوا قَائِمًا. قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنْ
اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ. وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ.
یعنی یہ لوگ ابھی تک تربیت نہیں پاسکے۔ ان میں ابھی جاہلانہ
عادات اور رسوم باقی ہیں، جیسے ہی ان کی نظر مالِ تجارت
پر پڑتی ہے یا ڈھول کی آواز ان کے کان میں آتی ہے
یہ آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ کر ان چیزوں کے پیچھے چل پڑتے
ہیں۔ (سورہ جمعہ - آیت ۱۱)
اس آیت میں درج ذیل قصے کی طرف اشارہ ہے:

ایک روز رسولِ خداؐ کھڑے ہوتے جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ ڈھول کی آواز آئی جو اس بات کی علامت تھی کہ سامان تجارت آگیا ہے لوگ اس ڈر سے کہ کہیں سامان ختم نہ ہو جائے، پیغمبرؐ کو کھڑا ہوا چھوڑ کر چلے آئے۔

مقصد اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ وَتَرْكُوكَ قَائِمًا یعنی ”آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ دیا“ سے ظاہر ہے کہ آپ کھڑے ہو کر خطبہ پڑھ رہے تھے۔

کہتے ہیں کہ بیٹھ کر خطبہ پڑھنے کی بدعت معاویہ کی ایجاد ہے۔ رہی یہ بات کہ جمعہ کی نماز کا امام اور خطیب ایک ہی شخص ہونا چاہیے یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ خطیب کوئی اور ہو اور امام جماعت کوئی اور؟ تو یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ اکثریت اسی کی قائل ہے کہ خطیب اور امام جماعت ایک ہی ہونا چاہیے، بلکہ بعض کے نزدیک امام جمعہ کی اولین شرط یہی ہے کہ وہ خطبہ دینے کے قابل ہو۔ اکثر روایات میں اس بات کو اِمَامٌ تَخْطُبُ کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے، ایک اور بات یہ ہے کہ جب امام خطبہ کے لیے کھڑا ہو، تلوار، نیزہ یا عصا پر ٹیک لگاتے اور اسی حالت میں خطبہ دے۔

جمعہ کے خطبہ میں حمد و ثنائے الہی، ذکرِ رسولِ اکرمؐ و ائمہ اطہارؑ اور قرآن کی ایک سورت کی تلاوت کے علاوہ یہ ضروری ہے کہ خطیب وعظ و نصیحت کرے اور جو باتیں مسلمانوں کے لیے ضروری ہوں، ان کو بیان کرے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ جمعہ کے خطبہ میں کن مضامین کا بیان ضروری ہے، ہمیں ایک اور روایت سے ہدایت ملتی ہے :

وَسَائِلُ الشَّيْخِ جِلْدِ اَوَّلِ فِي اِن اَحَادِيثِ كِى ضَمِنَ فِي بَوَاطِيئِهِ
 جَمْعُ سَمْتِ لِقِ اِيْكَ اَحَدِيْثِ عِلَلِ الشَّرَائِعِ اَوْرُ هَيُوْنُ اَنْبِيَا رِضَا
 كِى حَوَالِ سَمْتِ نَقْلِ هُوْتِ هِىَ - اِسْ اَحَدِيْثِ كُو فِضْلِ بِنِ شَاذَانَ نِيْشَا پُوْرِي
 نَمُو هَمَارِ سَمْتِ اَكْبَارِ اَوْر ثِقَةِ رُوَاةِ فِي سَمْتِ هِيْ اِمَامِ عَلِي رِضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ
 سَمْتِ رُوَايَتِ كِيَا هِىَ - اِسْ فِي سَمْتِ هِىَ :

”اِنَّمَا جُعِلَتِ الْخُطْبَةُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ لِاَنَّ
 الْجُمُعَةَ مَشْهُدٌ عَامٌّ.“

يَسْنِي جَمْعُ كِى دِنِ خُطْبَةِ اِسْ يَسْمُو مَقْرَرُ كِيَا كِيَا هِىَ كِى
 جَمْعُ عَامِ اِجْتِمَاعِ كَا دِنِ هِىَ اَوْر اِسْ دِنِ سَبْ لُوْكَوْنِ كُو
 اِسْ اِجْتِمَاعِ فِي شَرِكْتِ كَرْنِي چَا هِىَ -

فَاَرَادَ اَنْ يَكُوْنَ لِاِمِيْرٍ سَبَبٌ اِلَى مَوْعِظَتِهِمْ
 وَتَرْغِيْبِهِمْ فِي الطَّاعَةِ وَتَرْهِيْبِهِمْ مِنَ الْمَعْصِيَةِ
 اللّٰهُ تَعَالَى نَمُو يَسْمُو قَاعِدِ اِسْ يَسْمُو مَقْرَرُ كِيَا هِىَ تَا كِى
 قَوْمِ كَا اِمِيْرِ اِبْنِيْ جَمَاعَتِ كِى سَامْنِ وَعِظْ كِى سَكُو نَهِيْ
 طَاعَتِ كِي تَرْغِيْبِ دَمُو سَكُو اَوْر كِنَا هُوْنِ كِى رُسْمِ تَا نَجْ
 سَمْتِ دُرَا سَكُو -

وَتَوْقِيْفِهِمْ عَلَى مَا اَرَادَ مِنْ مَّصْلَحَةٍ دِيْنِهِمْ
 وَدُنْيَا هُمْ .

اَوْر سَا تَحْ هِيْ اَنْهِيْ اَكَا هِىَ كِى اِن كِى دِيْنِيْ اَوْر دُنْيَا
 مَفَادِ كَا تَقَا ضَا كِيَا هِىَ اَوْر اَنْهِيْ بَلَا سَكُو كِى دَر حَقِيْقَتِ اِن
 كِي بَهْلَانِيْ كِى سَمْتِ بَاتِ فِي سَمْتِ هِىَ -

وَيُخْبِرُهُمْ بِمَا يَرَدُّ عَلَيْهِمْ مِنَ الْأَفَاقِ
مِنَ الْأَحْوَالِ الَّتِي فِيهَا الْمَصْرَّةُ وَالْمَنْفَعَةُ.

مزید یہ کہ دُور دراز علاقوں میں مسلمانوں پر جو اچھی
بُری گزے اس کی اطلاع دے سکے۔ جو واقعات عالمِ اسلام
میں پیش آتے ہیں کبھی تو وہ مسلمانوں کے لیے ایک طرح
کی خوشخبری ہوتے ہیں مثلاً اگر اسلام کو کوئی کامیابی اور
ترقی حاصل ہو تو اس صورت میں مناسب ہے کہ لوگوں
کو آگاہ کیا جائے اور کبھی عالمِ اسلام کو کوئی حادثہ پیش
آجاتا ہے اس صورت میں بھی ضروری ہے کہ مسلمان
ایک دُورے کے حال سے واقف ہوں، مثلاً انھیں معلوم
ہو کہ اس ہفتہ فلسطین یا دنیا کے کسی اور مقام پر کیا کڑی
رہی یہ بات کہ دو خطبے کیوں پڑھے جائیں ایک ہی کیوں کافی نہیں
اور آیا ان دو خطبوں میں کچھ فرق ہے؟ اس کے متعلق بھی اسی حدیث
میں ہے کہ :

وَأِنَّمَا جُعِلَتْ حُطْبَتَيْنِ لِتَكُونَ وَاحِدَةً
لِلتَّنَاءِ عَلَى اللَّهِ وَالتَّحْمِيدِ وَالتَّقْدِيسِ لِلَّهِ عَزَّ
وَجَلَّ وَالْأُخْرَى لِلْحَوَائِجِ وَالْإِعْدَارِ وَالْإِنذَارِ
وَالدُّعَاءِ لِمَا يُرِيدُ أَنْ يُعَلِّمَهُمْ مِنْ أَمْرِهِ وَ
نَهْيِهِ وَمَا فِيهِ الصَّلَاحُ وَالْفَسَادُ.

یعنی اس کی وجہ کہ دو خطبے کیوں فرض ہوتے یہ ہے
کہ ایک میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تقدیس و تمجید

بیان کی جائے اور دوسرے میں لوگوں کی ضروریات کا تذکرہ
کیا جائے اور ان کو وعظ و نصیحت کی جائے۔ (لیکن جیسا کہ
صاحبِ وسائلِ الشیعہ نے کہا ہے کہ اس کی ہمیشہ
ضرورت نہیں ہوتی)۔

میں نے آج یہ سب گفتگو خطبہ و منبر کی بحث میں یہ بتانے کے لیے
کی ہے کہ اسلام میں ایک محکم ایسا بھی ہے جس کی روح سے خطابتِ جزو
دین قرار پاتی ہے۔ رہی یہ بات کہ شیعوں میں اس کا رواج کیوں نہیں، یہ
ایک الگ مسئلہ ہے۔ مجھے خود یقین نہیں آتا کہ اس بابرکت اور اہم نماز کی
مشرائط کو اس قدر سخت اور محدود کیوں سمجھا گیا کہ یہ عملاً منسوخ اور متروک
ہو گئی؟

مجھے ایک بات اور کہنی ہے اور یہ وعظ کا سوال ہے۔ وعظ اور
خطابت میں کچھ فرق ہے۔ خطابت ایک ہنر ہے اور اس کا ایک فنی پہلو
ہے۔ اس کے علاوہ خطابت کا مقصد جذبات اور احساسات کو کسی نہ کسی
طرح پر انگیزتہ کرنا ہے، مگر وعظ کا مقصد نفسانی خواہشات کو ٹھنڈا کرنا ہے
اور اس کا نمایاں پہلو برائیوں سے روکنا اور تنبیہ کرنا ہے۔

اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ خطابت کا مقصد مطلقاً قائل کرنا ہے تو پھر
وعظ بھی خطابت ہی کی ایک قسم ہے۔ بہر حال وعظ کا لفظ وہاں استعمال
کیا جاتا ہے جہاں ایسے فقرے استعمال کیے جاتیں جن کا مقصد تنبیہ کرنا،
روکنا اور بوقتِ ضرورت شہوت اور غصہ کو ٹھنڈا کرنا ہو۔

راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ

”الْوَعْظُ زَجْرٌ مُّقْتَرِنٌ كِبَالَتِ حَوَيْفٍ يَعْنِي وَعْظٌ

کے معنی روکنا ہیں ڈرنے کے ساتھ یعنی انجام سے ڈرانا۔
 پھر مشہور لغوی خلیل بن احمد کا قول نقل کرتا ہے :
 ”هُوَ التَّذَكُّيرُ بِالْخَيْرِ فِيمَا يَرِيقُ لَهُ الْقَلْبُ“
 یعنی وعظ نیک کاموں کی یاد دہانی ہے ایسے طریقے سے
 کہ دل نرم پڑ جائے۔ لہذا وعظ وہ تقریر ہے جو رقتِ
 قلب پیدا کرے۔

لوگوں کو ہوا پرستی، شہوت رانی، سُود خوری، ریا کاری سے روکنا
 اور موت، قیامت اور دُنیا و آخرت میں اعمال کے اچھے بُرے نتائج کی یاد
 دلانا وعظ ہے۔

اس کے برخلاف خطابت کی مختلف اقسام ہیں، کبھی اس کا مقصد
 جوش دلانا اور جنگ پر آمادہ کرنا ہوتا ہے، کبھی اس کا مقصد سیاسی ہوتا
 ہے، کبھی عدالت کو متاثر کرنا ہوتا ہے، کبھی اس کا استعمال دینی اور
 اخلاقی مقاصد کے لیے ہوتا ہے، کبھی میدانِ جنگ میں سپاہیوں کی بہت
 بڑھانے کے لیے، کبھی لوگوں کو ان کے سیاسی اور سماجی حقوق سے آگاہ
 کرنے کے لیے، کبھی رحم کے جذبات اُبھارنے کے لیے، جیسے مثلاً وہ تقریر
 جو وکیل عدالت میں مجرم کی سزا میں تخفیف کرنے یا رحم کی درخواست کے
 سلسلے میں کرتے ہیں۔ اسی طرح کبھی اس کا مقصد دینی و اخلاقی شعور
 کو بیدار کرنا ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں خطابت سے زیادہ وعظ کا رواج ہے۔ حالانکہ جیسا کہ
 میں نے ابھی عرض کیا خطابت کی بہت سی اقسام موجود ہیں، شاید اس
 کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں وعظ کا زیادہ رواج ہے، ہماری مجالس زیادہ

وعظ کا رنگ رکھتی ہیں اور نماز جُہد جس کے خطبوں میں مختلف رنگ ہوسکتے تھے ہمارے یہاں متروک ہے۔

مجالس وعظ کے نام سے جو چیز ہمارے یہاں باقی ہے وہ ان مجالس کی یادگار ہے جو صوفیوں نے ایجاد کی تھیں یعنی یہ کہ باقاعدہ مجلس تشکیل دی جاتے، کچھ لوگ سننے کے لیے جمع ہوں اور ایک شخص باقاعدہ واعظ و ناصح کی حیثیت سے گفتگو کرے۔ بظاہر یہ صوفیوں کی ایجاد ہے۔ یہ ایک اچھی بات تھی اس لیے بعد میں دوسروں نے بھی ایسی مجالس منعقد کیں۔ ہمارے یہاں صدیوں سے ایسی کتابیں موجود ہیں جو مجالس وعظ کے نام سے ترتیب دی گئی تھیں، جیسے مجالس سعدی اور مجالس رومی وغیرہ یہ ایک اچھا کام تھا، بعد میں دوسروں نے بھی اس کی تقلید کی۔ شیعوں نے سید الشہداء کی عباداری اور شیعہ خوانی کو رواج دیا۔ یہ بھی بہت اچھا کام کیا۔

میرا خیال ہے کہ مجالس وعظ چونکہ ابتدا میں صوفیوں کی تقلید میں شروع ہوتی تھیں اور تصوف کی بنیاد چونکہ نفسانی خواہشات کو دبانے اور تہذیب و تزکیہ نفس پر ہے اس لیے یہ موضوع وعظ سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ ہمارے خطیب اگرچہ صوفی نہیں ہیں تاہم وہ بھی زہد اور ترک ہوا وہوس ہی کے پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

بُنجُ البلاغہ میں جو امیر المومنینؑ کے کچھ خطبات کا مجموعہ ہے، مختلف اقسام کے خطبے شامل ہیں۔ اس میں موثر مواعظ بھی ہیں اور پرجوش خطبات بھی۔ مفتی اعظم مصر شیخ محمد عبدالعزیز نے بُنجُ البلاغہ کی ایک مختصر شرح اور اس کا مقدمہ لکھا ہے۔ وہ اپنے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

” جب میں نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے اس میں انواع و اقسام کی عبارت ملی جس نے مجھے حد درجہ متاثر کیا۔ اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک منظر کے بعد دوسرا منظر میری آنکھوں کے سامنے آ رہا ہے۔ کبھی یوں معلوم ہوتا تھا کہ لوگ شیر اور چیتے کی کھالیں پہنے حملہ کے لیے تیار ہیں۔ میں خود اس قدر متاثر تھا کہ میرا دل چاہنے لگتا تھا کہ میں بھی میدانِ جنگ میں جا کر دشمنوں کا خون بہاؤں اور خود بھی چر کے پر چرکا کھاؤں۔ پھر دیکھتا تھا کہ منظر بدل گیا۔ میں ایک واعظ کے روبرو ہوں جو اپنی باتوں سے دلوں کو نرمی اور لطافت بخش رہا ہے، انھیں پاکیزگی اور صفائی عطا کر رہا ہے۔ پھر اچانک ایک اور منظر آتا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ ایک سیاست دان اور سماجی مصلح کھڑا ہوا عوام کے مفاد کی بات کر رہا ہے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک فرشتہ عالم بالا سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے ہے اور چاہتا ہے کہ لوگوں کو عالم بالا کی طرف کھینچ لے۔“

یہ واقعہ ہے کہ نینج البلاغہ میں انواع و اقسام کے خطبے ملتے ہیں ان میں وعظ و نصیحت بھی ہے، توحید و معرفت کا بیان بھی۔ ان میں سیاسی خطبے بھی ہیں اور رزمیہ خطبے بھی۔ یہاں میں نمونہ کے طور پر ایک رزمیہ خطبے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نقل کرتا ہوں۔

جنگِ صفین میں لشکرِ علیؑ اور لشکرِ معاویہؑ ایک دوسرے کے مقابل

پہنچتے ہیں، حضرت علیؑ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ لشکرِ معاویہ نے پیش قدمی کر کے گھاٹ پر قبضہ کر لیا ہے اور ہمارا پانی روک دیا ہے، ہمیں اجازت دی جائے کہ فوراً جنگ شروع کر دیں تاکہ گھاٹ پر دوبارہ قبضہ کر سکیں۔ آپ نے فرمایا: ٹھہرو! ممکن ہے ہم بات چیت کے ذریعہ اس قضیے کا حل نکال لیں۔ آپ نے خط لکھ کر قاصد کے ہاتھ بھیجا کہ ہم یہاں پہنچ گئے ہیں لیکن ہماری کوشش یہ ہے کہ ہتھیار استعمال کرنے کی بجائے مذاکرات کے ذریعہ سے اختلافات کو دُور کیا جائے۔ تم نے سب سے پہلے بڑھ کر ہمارے لشکریوں کا پانی بند کر دیا۔ مناسب یہ ہے کہ اپنے آدمیوں کو فوراً حکم دو کہ پانی کھول دیں۔

معاویہ نے اس بات پر کوئی دھیان نہیں دیا بلکہ گھاٹ پر قبضہ کو اپنے لیے کامیابی تصور کیا۔ عمرو بن عاص نے جو معاویہ کا وزیر و مشیر تھا کہا بھی کہ آپ حکم جاری کر دیجیے کہ مزاحمت نہ کریں، علیؑ ایسے آدمی نہیں کہ پیاسے رہیں اور گھاٹ کا قبضہ نہ لے سکیں۔ مگر معاویہ نہیں مانا۔ بالآخر چند بار قاصدوں کی آمد و رفت کے بعد علیؑ مجبور ہو گئے کہ حکم دیں کہ حملہ کر کے معاویہ کے لشکریوں کو پیچھے دھکیل دیا جائے۔

یہاں موقع تھا جوش دلانے اور غیرت و حمیت کو اُبھانے کا حضرت علیؑ کے تین چار ہی جملوں نے وہ جوش و خروش پیدا کیا کہ ذرا سی دیریں معاویہ کی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ جب بھی میں یہ جملے پڑھتا ہوں میرے بدن میں کپکپی پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ مجھے یہ ہیں:

قَدْ اسْتَطَعْتُ مَوْكُمُ الْقِتَالِ .

یعنی ان لوگوں نے پیش قدمی کی ہے اور جس طرح

کوئی بھوکا غذا تلاش کرتا ہے، یہ تم سے جنگ کے خواہاں ہیں۔

فَاقْرَؤُوا عَلٰی مَذَلَّةٍ وَّ تَأْخِيرٍ مَّحَلَّةٍ اَوْ
رَقُّوا السُّيُوفَ مِنَ الدِّمَاءِ تَرَوْا مِنَ الْمَاءِ
اس لیے اب صرف دو راستے ہیں یا تو ذلت پسندی
اور عقب نشینی برداشت کرو یا ان نابکاروں کے خون
سے اپنی تلواروں کو سیراب کرو تاکہ تم پانی سے سیراب
ہو سکو۔

فَإِنَّ الْحَيَاةَ فِي مَوْتِكُمْ قَاهِرِينَ وَالْمَوْتَ
فِي حَيَاتِكُمْ مَقْمُورِينَ .

زندگی اس میں ہے کہ تم جان دے دو اور کامیاب
و کامران ہو کر غالب آؤ اور موت اس میں ہے کہ تم زندہ
رہو مگر مغلوب و مقمور ہو کر۔

ان چند جملوں سے لشکرِ یانِ امامؑ کی غیرت و حمیت کو وہ جوش
آیا کہ انھوں نے تھوڑی ہی دیر میں معاویہ کے ساتھیوں کو پیچھے دھکیل دیا۔
اب میں ایک دو فقرے علیؑ کے فرزندِ عزیزِ حسینؑ بن علیؑ کے
خطبوں میں سے بھی بطور نمونہ پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ گو آج کل ہمارے
یہاں جموعہ کے خطبہ کار رواج نہیں لیکن امام حسینؑ کی برکت سے خطبے
اور منبر باقی ہیں۔ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی خطبے ہیں لیکن ہمارے
ملک میں دینی خطبوں کی بنیادِ عباداریِ حسینؑ بن علیؑ پر قائم ہے۔

ابو عبد اللہؑ ہر معاملے میں اپنے والد بزرگوار کے قدم بہ قدم تھے یہی صورت ان کی خطابت کی بھی تھی لیکن ابو عبد اللہؑ کو اتنا موقع بھی نہیں ملا جتنا امیر المؤمنینؑ کو اپنے دورِ خلافت میں ملا تھا۔ تھوڑا سا موقع جو ابو عبد اللہؑ کو ملا وہ اس سفر کے دوران میں تھا جو آپ نے مکہ سے کربلا تک فرمایا یا پھر اُن اٹھ دنوں میں جب آپ کا قیام کربلا میں رہا۔ اس تھوڑی سی مدت ہی میں آپ کے جوہر کھلے۔ جو خطبے آپ کے اس وقت موجود ہیں وہ بیشتر اسی مدت میں دیے گئے تھے۔

امام حسینؑ کے خطبے اپنے والد بزرگوار کے خطبوں کا بعینہ نمونہ ہیں ان کی رُوح وہی ہے اور وہی معانی ان میں موجزن ہیں۔

خود امام علیؑ نے فرمایا تھا کہ

”زبان رُوح کا آلہ ہے۔ اگر معانی زبان پر نازل نہ ہوں تو زبان کیا کام دے سکتی ہے لیکن اگر معانی رُوح میں موجزن ہوں تو پھر زبان ان کو نہیں روک سکتی۔“
آپ نے فرمایا ہے :

وَاِنَّا الْاَمْرَاءُ الْكَلَامِ وَفِيْنَا تَنْشِبَتْ عَرْوَةٌ
وَعَلَيْنَا تَهْدَلَتْ عَصْوَةٌ.

ہم امیرِ سخن ہیں، اس کی جڑیں ہمارے وجود میں پیوست

ہیں اور اس کی شاخیں ہمارے سر پر سایہ فگن ہیں۔

حسین بن علی علیہما السلام کا پہلا خطبہ جو کمال فصاحت و بلاغت کا منظر اور ذکاوت و شجاعت اور بلند نظری اور ایمان بالغیب سے مالا مال ہے، وہ خطبہ ہے جو آپ نے مکہ میں اُس وقت دیا جب آپ کربلا کے لیے

روانہ ہو رہے تھے۔ اس میں آپ نے اپنے مُصَمَّم عَزَم کا اعلان کیا اور مُتَمَنَّا
یہ بھی فرمایا کہ جو شخص ہمارا ہم فکر وہم عقیدہ ہو وہ ہمارے ساتھ چلے۔

حُطَّ الْمَوْتُ عَلَى وُلْدِ آدَمَ مَنَحَطَّ الْقَلَادَةَ
عَلَى جَيْدِ الْفَتَاةِ وَمَا أَوْلَاهَنِي إِلَى اسْلَافِي اشْتِيَاقَ
يَعْقُوبَ إِلَى يُوسُفَ .

موت نے فرزندِ آدمؑ کو اس طرح نشان زدہ کر دیا
جسے جس طرح گلوبند کا نشان جوان عورت کی گردن پر پڑتا
ہے۔ میں اپنے اسلاف سے ملاقات کا اسی طرح مُشتاق
ہوں جس طرح یعقوبؑ یوسفؑ سے ملاقات کے مُشاق
مَنْ كَانَ فِيْنَا بَاذِلًا مَهْجَتَهُ مَوَظَّنًا عَلَى لِقَاءِ
اللَّهِ نَفْسَهُ فَلْيُرْحَلْ مَعَنَا . فَلْيُرْجِلْ رَاجِلٌ مُصْبِحًا
إِنْ شَاءَ اللَّهُ .

جو شخص ہمارے لیے جان نثاری پر آمادہ ہو اور
اپنے پروردگار سے ملاقات کے لیے تیار ہو وہ ہمارے ساتھ
چلے ، میں انشاء اللہ کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔

دورانِ سفر میں بھی آپ نے متعدد خطبات دیے ، وہ خطبات تو
اپنی جگہ ہیں ، میں یہاں شبِ عاشورا کے خطبے کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔
اس رات کو اولِ شب ہی میں اس واقعہ کے بعد جو نویں تاریخ کی
شام کو پیش آیا تھا ، ابن زیاد نے سختی کے ساتھ حکم دے دیا تھا کہ ” اس
چٹھی کے پہنچتے ہی قصہ پاک کرو۔“ تب امام حسینؑ نے دشمن سے ایک
رات کی مُہلت چاہی اور فرمایا کہ

”خداوندِ عالم جانتا ہے کہ میں یہ ٹہلت محض اس لیے نہیں چاہتا کہ ایک رات اور زندہ رہوں بلکہ اس لیے چاہتا ہوں کہ آج کی رات کو جو میری زندگی کی آخری رات ہے، نماز، دُعا، ذکر و مناجات اور استغفار میں گزاروں۔“

خداوندِ عالم خود جانتا ہے کہ مجھے یہ اعمال کس قدر محبوب ہیں بہر حال کچھ رد و قدح کے بعد دشمن نے ٹہلت دے دی۔ رات ہوئی تو جَمَعَ الْحُسَيْنُ أَصْحَابَهُ عِنْدَهُ قُرْبَ الْمَاءِ يَعْنِي إِمَامِ حُسَيْنٍؑ نے اپنے اصحاب کو اس خیمہ میں جمع کیا جہاں عموماً پانی کی مشکیں رکھی جاتی تھیں آپ نے اپنے عالی مرتبت اصحاب کو مخاطب کر کے فرمایا:

أُشْنِي عَلَى اللَّهِ أَحْسَنَ الثَّنَاءِ وَأَحْمَدُهُ
عَلَى السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ اللَّهُمَّ إِنِّي أَحْمَدُكَ
عَلَى أَنْ أَكْرَمْتَنَا بِالنُّبُوَّةِ وَعَلَّمْتَنَا الْقُرْآنَ
وَفَقَّهْتَنَا فِي الدِّينِ .

”میں اللہ کی بہترین ستائش کرتا ہوں اور ہر حالت میں راحت ہو یا تکلیف اُس کی حمد کرتا ہوں۔
بارِ الہا! میں تیرا سپاس گزار ہوں کہ تو نے ہمیں نبوت سے سرفراز فرمایا، ہمیں قرآن کا علم دیا اور ہمیں دین کی سمجھ عطا کی۔“

جس وقت آپ یہ فرما رہے تھے، اس وقت آپ کو بلا میں مٹھو تھے اور یہ قطعی طور پر طے ہو چکا تھا کہ کل آپ کو قتل کر دیا جائے گا۔ آپ جانتے تھے کہ کل آپ کے نوجوان ساتھی قتل کر دیے جائیں گے،

آپ کو بخوبی علم تھا کہ کل رات اس وقت آپ کے بیوی بچے دشمنوں کے ہاتھ میں اسیر ہوں گے، آپ کی اولاد بے رحم دشمنوں کے چنگل میں ہوگی اس کے باوجود، اس کلام کو دیکھیے، اس کی رُوح کو دیکھیے، اس میں مضر رُوحانی تجلیات کو دیکھیے، شکر گزاری کی شان کو دیکھیے! چونکہ آپ اپنی ہر تکلیف کو خدا کی طرف سے سمجھتے تھے، اس لیے آپ کو اس کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں تھی، آپ اپنے اللہ کے شکر گزار تھے، اس کی شانِ اقدس میں حمد و ثنا کے پھول نچھاور کر رہے تھے، آپ فرما رہے تھے کہ ”رن ہو یا راحت، آرام ہو یا تکلیف، میں ہر حال میں اپنے اللہ کا شکر گزار ہوں ہر حال میں قضاے الہی پر راضی اور خوش ہوں۔ اگر ایک دن، میں رسولِ اکرم کے دامنِ محبت میں آسودہ تھا، آپ کا دستِ شفقت میرے سر پر تھا تو میں اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور اگر کسی دن، مثلاً کل ہی میں گرم ریت پر تشنہ دہن پڑا تو پاب رہا ہوں گا جب بھی خدا کا شکر ادا کرتا رہوں گا، کیونکہ یہ حالت بھی رضائے معبود کے حصول کے لیے ہی ہوگی۔ اگر ایک دن ایسا تھا کہ رسولِ خدا میرے ہونٹوں کو چومتے تھے تو میں اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور اگر کبھی ایسا دن آیا کہ حق کوئی کی پاداش میں میرے ان حق آشنا ہونٹوں کو بید کی چھڑی سے واسطہ پڑا جب بھی چونکہ یہ تکلیفِ راہِ حق میں ہوگی، میں اپنے پروردگار کا شکر گزار ہی رہوں گا۔ میرا مقام فقط مقامِ صبر نہیں مقامِ شکر بھی ہے۔“

اس کے بعد امام علیہ السلام نے اپنے پروردگار کی ان بڑی بڑی نعمتوں کا ایک ایک کر کے ذکر کیا جن کی برابری کوئی نعمت نہیں کر سکتی، اور ان نعمتوں پر دل کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر کیا۔ آپ نے فرمایا:

”یا الہی! میں تیری حمد کرتا ہوں کہ تو نے ہمارے خاندان کو نبوت سے مُعزّز و مُتمتّاز فرمایا۔ آخر نبوت سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہو سکتا ہے؟“

یا الہی! میں تیری حمد کرتا ہوں کہ تو نے ہمیں قرآن سکھایا۔ قرآن کے علم کے لیے ہمیں مُنتخب فرمایا۔

میں تیری حمد کرتا ہوں کہ تو نے ہمیں دین کی بصیرت عطا کی۔ خُدا یا اگر سب نعمتیں بھی یکجا کر دی جائیں جب بھی وہ سب مل کر اس نعمت کی برابری نہیں کر سکتیں کہ تو نے ہمیں قرآن کے علم کے لیے مُنتخب فرمایا۔ اسی طرح سب نعمتیں مل کر بھی رسول اکرمؐ سے ہمارے جسمانی اور رُوحانی تعلق اور رشتے کی برابری نہیں کر سکتیں اور نہ سب نعمتیں مل کر اس نعمت کا مقابلہ کر سکتی ہیں کہ مجھ پرین کی رُوح اور اس کے معنی پر عبور عطا فرمایا گیا ہے۔“

اس کے بعد امام حسین علیہ السلام اپنے اہل خاندان اور اپنے اصحاب سے مخاطب ہوئے، ان سے اظہارِ تشکر و خوشنودی فرمایا اور ان کی بہت تعریف کی۔ آپ نے فرمایا:

”أَمَّا بَعْدُ! فَإِنِّي لَا أَعْلَمُ أَصْحَابًا أَوْفَى وَلَا خَيْرًا مِّنْ أَصْحَابِي وَلَا أَهْلَ بَيْتِ آبٍ وَلَا أَوْصَلَ وَلَا أَفْضَلَ مِنْ أَهْلِ بَيْتِي فَجَزَاكُمُ اللَّهُ عَنِّي خَيْرَ الْجَزَاءِ.“

میں اپنے ساتھیوں سے زیادہ وفادار اور بہتر

ساتھیوں اور اپنے اہل خاندان سے زیادہ نیک اور شستہ دلی
 کا حق ادا کرنے والے کسی خاندان سے واقف نہیں۔
 اللہ تعالیٰ آپ سب کو میری طرف سے جوڑے خیر
 عطا فرمائے۔“

اس کے بعد امامؑ کی رُوحِ استغفارِ ملاحظہ ہو، واقعی استغفار کی کیا
 شان ہے! آپ نے سب کو اجازت دے دی اور فرمایا :
 ”ان لوگوں کو میرے سوا کسی سے کچھ غرض نہیں۔
 اگر یہ مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر کسی
 اور کے درپے آزار نہیں ہوں گے۔ آپ لوگ رات کی
 تاریکی سے فائدہ اٹھا کر جاسکتے ہیں۔“
 ایک روایت کے مطابق آپ نے یہ کہہ کر اپنا سر جھکایا تھا تاکہ اگر
 کوئی جانا چاہے تو اسے شرمندگی نہ ہو۔

اب دیکھیے کہ ان کے اصحاب نے کیا جواب دیا ؟
 سب سے پہلے جس نے بات کی وہ امامؑ کے سعادت مند بھائی
 اَبُو اَفْضَلِ العَبَّاسِ تھے، دوسرے بھی آپ کے ہم آواز تھے۔ آپ نے کہا کہ
 ”بھائی جان! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کو تنہا
 چھوڑ کر چلے جائیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو خدا کو کیا جواب
 دیں گے ؟ اس کے رسولؐ کو کیا جواب دیں گے ؟ آپ کے
 بعد چینے کا کیا مزہ ہے۔“

پھر مُسْتَلِمِ بنِ نُوْتُوْبِہِ اپنی جگہ سے اُٹھے اور بولے :
 ”اَنْحَنُ نَحْلِي عَنْكَ ؟ کیا میں آپ کو تنہا چھوڑ

دوں؟ نہیں، بخدا! میں ان بد بخت نابکاروں سے اُس وقت تک لڑتا رہوں گا جب تک کہ اپنے نیزے کی آنی ان کے سینوں میں نہ اُتار دوں اور جب تک تلوار کا دستہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر میرے پاس ہتھیار نہیں ہوں گے تو میں آپ کے دشمنوں پر پتھر پھینک کر اپنا فرض پورا کروں گا تاکہ اللہ کے نزدیک یہ مستحق ہو جائے کہ اُسوں کو خدا کی طرف سے آپ کے بارے میں جو فرض مجھ پر عائد ہوتا تھا، میں نے اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی۔

اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ میں قتل ہو جاؤں گا اور پھر زندہ کیا جاؤں گا اور پھر قتل ہوں گا، پھر میری لاش کو جلا دیا جائے گا اور میری راکھ ہو ا میں بکھیر دی جائے گی اور یہ عمل ستر بار دہرایا جائے گا، جب بھی میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ چہ جائیکہ یہ معلوم ہو کہ صرف ایک دفعہ کی جاں نثاری کی بات ہے اور اس کے بعد عقیلی میں عورت ہی عزت ہے۔“

اس رات اگر کوئی چیز امام حسینؑ کے دل کو تسکین پہنچا سکتی تھی تو وہ یہی باتیں تھیں اور ان کے ساتھیوں کے یہی سچے جذبات تھے۔

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ
الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

خُطْبُہ اور منبر

(۲)

أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
الرَّحْمَنُ. عَلَّمَ الْقُرْآنَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ.
عَلَّمَهُ الْبَيَانَ.

میں نے پچھلی تقریر میں خطابت اور اسلام کے تعلق اور اس تقریر کے بارے میں گفتگو کی تھی جو اسلام نے خطابت میں پیدا کیا۔ میں نے اس ضمن میں اس اسلامی حکم کا بھی تذکرہ کیا تھا جس کے مطابق اسلام نے ایک خاص طرز کے خطبہ کو اسلامی تعلیمات کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔

گوہما گئے ملک میں خطبہ اور منبر کا وجود فاجعہ کر بلا کی وجہ سے ہے لیکن چونکہ میں اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنا چاہتا تھا اس لیے اس ضمن میں نماز جمعہ کی بحث ناگزیر تھی۔ اس کے علاوہ میں نے ان

آداب و قواعد کا بھی تذکرہ کیا تھا جو خطبہِ جمعہ کے باب میں وارد ہوتے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ جب میں دوبارہ خطبہ کے بارے میں گفتگو کروں تو یہ بھی تجویز پیش کر سکوں کہ ہمیں آج بھی ان احکام پر عمل کرنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ملک میں خطبہ و منبر کا وجود شہادتِ عظمیٰ کا رہنِ منت ہے۔ وہ کیسے؟ وہ ایسے کہ جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ سیال شہدار امام حسین علیہ السلام نے اپنے زمانے میں مروتیہ نظام کے خلاف تحریک چلاتی اور شہید ہوتے۔ سید الشہداء کی عباداری کے بارے میں ایسی روایات آتی ہیں کہ کوئی شیعہ ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ عباداری شیعہ مذہب کے مسلمات میں سے ہے۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے کہ عاشورے کی یاد کو قائم رکھا جائے۔ شعراء کو ہدایت کی گئی ہے کہ اس موضوع پر شعر کہیں اور لوگوں کے احساسات کو جھنجھوڑیں۔ جو لوگ عاشورے کی یاد سے متاثر ہو کر آنسو بہاتے ہیں ان کے اس فعل کو مقدس قرار دیا گیا ہے۔ بکثرت احادیث ہیں گریہ و بکا کی فضیلت آئی ہے۔ آج میں یہ احادیث سننا نہیں چاہتا، لیکن اجمالاً اتنا عرض کرتا ہوں کہ کسی شیعہ کے لیے انکار کی گنجائش نہیں کہ ہمارے مذہب میں یہ حکم ہے۔

یہاں دو امور پر گفتگو ضروری ہے :
 ایک تو یہ کہ امام حسینؑ کے قیام کا فلسفہ کیا تھا؟ امام حسینؑ نے قیام کیوں کیا؟ ان کے قیام کا محرک کیا تھا؟
 دوسرے یہ کہ ائمہ دین نے یہ تاکید کیوں کی ہے کہ امام حسینؑ کے قیام کی یاد ہمیشہ باقی رکھی جائے اور بھلائی نہ جائے۔ آخر عاشورے کے

موضوع کو زندہ رکھنے کا فلسفہ کیا ہے ؟

ہم شیعوں کے عقیدے کے مطابق دین کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں، اس لیے ان دونوں باتوں کی بھی حکمت معلوم ہونی چاہیے۔ اگر یہ حکمت معلوم ہو جائے تو اس وقت معلوم ہوگا کہ ان احکام کی کیا اہمیت ہے اور واقعہ کربلا سے متعلق احکام سے ہمیں کس قدر زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

امام حسینؑ نے قیام کیوں کیا ؟

اس کی تین طرح سے توجیہ کی جاسکتی ہے :

ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ امام حسینؑ کا قیام ایک معمولی واقعہ تھا جس کا مقصد معاذ اللہ محض ذاتی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش تھا۔ مگر یہ ایسی توجیہ ہے جس کو کوئی مسلمان ہرگز پسند نہیں کر سکتا اور نہ تاریخی واقعات ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

دوسری توجیہ وہ ہے جو اکثر عوام الناس کے ذہن میں آتی ہے کہ اُمت کے گناہوں کو بخشوانے کے لیے امام حسینؑ نے جان دی اور شہید ہوئے۔ یعنی آپ کی شہادت دراصل اس اُمت کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ یہ بالکل ویسی ہی بات ہے جیسی کہ عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کے بارے میں گھڑی ہے اور اپنا عقیدہ بنا لیا ہے کہ اپنی اُمت کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے حضرت عیسیٰؑ صلیب پر چڑھ گئے۔

بالفاظِ دیگر، امام حسینؑ اس لیے شہید ہوئے کہ گنہگاروں کو آخرت میں جو سزا ملنی تھی وہ نہ ملے تاکہ لوگ آزادی سے گناہ کر سکیں۔ اس عقیدے کا مطلب یہ ہوا کہ امام حسینؑ نے دیکھا کہ کچھ بڑی،

ابن زیاد، شمر اور سنان ہیں تو سہی لیکن ان کی تعداد کم ہے لہذا انھوں نے سوچا کہ کوئی کام ایسا کیا جائے کہ ان لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو، چنانچہ انھوں نے یزید سازی اور ابن زیاد سازی کا کارخانہ قائم کر دیا تاکہ یہ آئندہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا ہو سکیں۔ یہ طرز فکر اور یہ توجیہ انتہائی خطرناک ہے۔ امام حسینؑ کی تحریک کے اثر کو زائل کرنے ان کے مقاصد کے خلاف نبرد آزما ہونے اور عواداری امام حسینؑ کے متعلق جو احکام ہمیں ملے ہیں ان کو سبوتاژ کرنے اور غیر معقول ثابت کرنے کا اس طرز فکر سے زیادہ موثر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ آپ یقین کریں کہ ہم جو اعمال کی بجا آوری میں اتنے بے پروا اور لالچالی واقع ہوتے ہیں اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ امام حسینؑ کی تحریک کی اتنی غلط توجیہ کی گئی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ایک وجہ کہا کیونکہ اور بھی وجوہات ہیں جن کا تعلق قومی اور نسلی پہلو سے ہے۔

مُرجئہ کا عقیدہ تھا کہ ایمان اور اعتقاد کافی ہے، نجات کے لیے عمل کی کوئی قید نہیں، اگر یہ عقیدہ درست ہے تو خداوند بے نیاز ہریدگی کو معاف کرے گا۔ اس فرقہ کے بائے میں جناب زید بن علی بن الحسینؑ نے کہا تھا کہ

هَؤُلَاءِ أَطْعَمُوا الْفُسَّاقَ فِي عَفْوِ اللَّهِ.

”یعنی ان لوگوں کی حرکت سے اس بھروسے پر کہ اللہ معاف کر دے گا فُسَّاق کی جُرأت بڑھ گئی ہے کہ وہ جتنے چاہیں گناہ کریں۔“

یہ اس وقت مُرجئہ کا عقیدہ تھا۔ شیعوں کا عقیدہ اس زمانے میں

اس کے بالکل برعکس تھا لیکن آج شیعہ بھی وہی کہتے ہیں جو زمانہ قدیم میں مُرجّہ کہتے تھے۔ اس وقت تو شیعوں کا عقیدہ اس نصِ قرآنی کے مطابق تھا:

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ .

یعنی ایمان بھی ضروری ہے اور عملِ صالح بھی۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ دُنیا تے اسلام میں کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ امام حسینؑ نے اُٹھ کھڑے ہونا اپنا فرض سمجھا۔ ان کی راتے میں اسلام کی بقا کے لیے ان کا اپنا قیام ضروری اور ان کا فرض تھا۔ خلیفہ وقت سے ان کا اختلاف اور نزاع اس بات پر نہیں تھا کہ تو خلیفہ ہو یا میں خلیفہ ہوں یا تو جس منصب پر فائز ہے وہ مجھے ملنا چاہیے۔ اختلاف بُنیادی اور اصولی تھا۔ اگر یزید کی بجائے کوئی اور شخص بھی یہی کام کرتا اور یہی روش اختیار کرتا تو امام حسینؑ اس کے خلاف بھی قیام کرتے، چاہے اس شخص کا سلوک خود امام حسینؑ کے ساتھ اچھا ہوتا یا بُرا ہوتا۔ یزید اور اس کے أعوان و أنصار بھی امام حسینؑ کی ہر قسم کی اعانت کے لیے تیار تھے، بشرطیکہ امام عالی مقامؑ ان کے کاموں سے تعرض نہ کریں اور ان کی روش پر صہاد کریں۔ اگر امام کوئی علاقہ مانگتے، مثلاً یہ کہتے کہ حجاز و یمن کی حکومت مجھے دے دو یا عراق کی یا خراسان کی حکومت میرے حوالے کر دو تو وہ یہ علاقہ ضرور دے دیتے۔ بلکہ اگر امام چاہتے تو اس علاقہ میں حکومت کا کُلّی اختیار بھی انھیں مل جاتا، جتنی چاہا، وُصولی کرتے اور جس طرح چاہتے خرچ کرتے۔ اگر دل چاہتا تو کچھ رقم مرکزی حکومت کو بھیج دیتے اور مزاجتا تو نہ بھیجتے۔ مگر درحقیقت امام حسینؑ کی

جنگ مسلک و عقیدہ کی جنگ تھی، حق و باطل کی جنگ تھی اور حق و باطل کی اس جنگ میں خود امام حسینؑ کی اپنی ذات کی حیثیت ثانوی تھی۔ آپ نے خود چند مختصر الفاظ میں یہ بات اپنے اصحاب پر واضح کر دی تھی۔ ایک خطبہ میں آپ نے فرمایا تھا اور غالباً اس وقت فرمایا تھا جب حُر اور ان کے ساتھی پہنچ گئے تھے، اس بنا پر یہ خطاب عام تھا۔

آپ نے فرمایا تھا :

أَلَا تَرَوْنَ أَنَّ الْحَقَّ لَا يَحْمَلُ بِهِ وَالْبَاطِلُ
لَا يَتَنَاهَى عَنْهُ. لِيَرْغَبَ الْمُؤْمِنُ فِي لِقَاءِ اللَّهِ
مُحِقًّا.

کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور باطل سے اجتناب نہیں کیا جاتا؛ ان حالات میں ہر مومن کا فرض ہے کہ شہادت کے لیے تیار ہو جائے۔

آپ نے یہ نہیں فرمایا لِيَرْغَبَ الْإِمَامُ یعنی امام کا فرض ہے کہ شہادت کے لیے تیار ہو جائے۔ آپ نے یہ بھی نہیں فرمایا کہ لِيَرْغَبَ الْحُسَيْنُ یہ حسین کا ذاتی فرض ہے، آپ نے فرمایا لِيَرْغَبَ الْمُؤْمِنُ مطلب یہ ہے کہ ان حالات میں مومن کا یہ کام ہے کہ موت کو زندگی پر ترجیح دے۔ جب حق پر عمل نہ ہو رہا ہو اور باطل پر کوئی روک ٹوک نہ ہو تو ہر مسلمان پر بحیثیت مسلمان کے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اٹھ کھڑا ہو اور جام شہادت نوش کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

ان تین توجیہات میں سے — ایک توجیہ تو وہ ہے جو کوئی دشمن حسینؑ ہی کر سکتا ہے — ایک توجیہ وہ ہے جو خود حسینؑ نے کی ہے

یہی یہ کہ وہ راہِ حق میں اُٹھے تھے — ایک اور توجیہ وہ ہے جو ان کے نادان دوست کرتے ہیں اور جو ان کے دشمنوں کی توجیہ سے بھی زیادہ خطرناک گمراہ کن اور حسینؑ کے مقصد و منشا سے بعید ترین ہے۔

یہاں سوال کا دوسرا حصہ کہ ائمہ دین نے مجالسِ غم برپا کرنے کی وصیت فرمائی، تو اس کی بھی وجہ وہی ہے جو ابھی میں نے عرض کی، امام حسینؑ نہ اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے شہید ہوتے، نہ اُمت کے گناہوں کے کفارہ کے طور پر انھوں نے اپنی جان عزیز قربان کی۔ انھوں نے تو راہِ حق میں اپنی جان دی اور باطل کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوتے۔ اس لیے ائمہ اہلبیتؑ نے یہ چاہا کہ امام حسینؑ کا مکتب شہادت باقی اور ان کی تحریک زندہ رہے۔

شہادتِ حسینؑ چونکہ حق و باطل کے مقابلہ کی تحریک ہے اس لیے اسے ہمیشہ قائم و دائم رہنا چاہیے ورنہ امام حسینؑ کو اس سے کیا فائدہ کہ ہم روئیں یا نہ روئیں۔ اور ہمیں خود بھی اس سے کیا فائدہ کہ پہلے تو بیٹھ کر روئیں اور پھر کپڑے جھاڑ کر چل دیں۔ ائمہ اہلبیتؑ تو یہ چاہتے تھے کہ قیام امام حسینؑ ایک تحریک اور ایک مشعلِ راہ کے طور پر ہمیشہ باقی رہے کیونکہ یہ حقیقتِ دوستی اور حقیقتِ طلبی کا ایک چراغ ہے اور حقِ طلبی اور حریت اور

لے رہے کبیر حضرت آیت اللہ خمینی نے فرمایا: امام حسینؑ کی مجلسِ عزاء منعقد کرنا اسلام کی بقا کا ذریعہ ہے۔ جو لوگ سید الشہداء کی مجالس کی مخالفت کرتے ہیں وہ اسلام کی حقیقت سے بالکل نا آشنا ہیں۔ عواد اری سید الشہداءؑ ہی نے آج تک اسلام کا تحفظ کیا ہے

آزادی کی پیکار۔ اس حریت و آزادی کی تحریک اور ظلم و استبداد کے مقابلہ کی تعلیم کو باقی اور زندہ رہنا چاہیے۔

اس حکم کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود ائمہ اہلبار کے زمانے ہی میں انقلاب برپا ہو گیا اور خود امام حسینؑ کا نام ظلم کے خلاف انقلاب کا نعرہ بن گیا، بہت سے انقلابی شاعر پیدا ہو گئے۔ کمیتِ آسدی پیدا ہو گیا، وغبیل خزاعی وجود میں آ گیا۔ جانتے ہو کمیتِ آسدی کون تھا؟ وغبیل خزاعی کون تھا؟ یہ دونوں روضہ خواں تھے لیکن میری طرح کے روضہ خواں نہیں۔ یہ مرثیہ گو شاعر تھے لیکن محتشم کاشانی وغیرہ کی طرح کے مرثیہ گو نہیں۔ دل چاہتا ہے کہ آپ کو کمیتِ آسدی، وغبیل خزاعی، ابن الرومی اور ابو فراس ہمدانی کے عربی اشعار سناؤں تاکہ آپ ان کا موازنہ محتشم کے اشعار سے کر سکیں جس کی تعریف و توصیف میں ہزاروں داستانیں زبان زد ہیں۔ مگر کہاں یہ اور کہاں وہ۔ خاک کو آسمان سے کیا نسبت؟ ان شعراء کے اشعار حسینی تعلیمات کی عکاسی کرتے تھے۔

صرف کمیتِ آسدی کے اشعار بنی اُمیہ کے لیے پورے ایک لشکر سے زیادہ ضرر رساں تھے۔ یہ شخص کون تھا؟ ایک مرثیہ گو تھا مگر ایسا مرثیہ گو نہیں کہ آہ کہ چند لٹے سیدھے اشعار سنائے اور کچھ روپے جیب میں ڈال کر چل دیا۔ وہ شعر کہتا تھا تو دُنیا کو ہلا دیتا تھا، دربارِ خلافت پر لرزہ طاری کر دیتا تھا۔

عبداللہ بن حسن بن علی المعروف بہ عبداللہ محض، کمیت کے جاندار اشعار سے ایسے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے کھیت کا قبائل لاکر اسے پیش کر دیا۔ کمیت نے کہا یہ تو کسی طرح ممکن نہیں کہ میں اسے قبول کر لوں میں تو

سیدالشہداءؑ کا مرثیہ خواں ہوں اور صرف رضائے الہی کی نیت سے مرثیہ کہتا ہوں، میں پیسے کمانے کے لیے شعر نہیں کہتا۔ عبداللہ کے بے حد اصرار پر اسے ماننا پڑا اور اس نے قبالہ لے لیا۔ کچھ دن بعد کئیت عبداللہ بن حسن بن علی کے پاس آیا اور کہنے لگا: میری آپ سے ایک درخواست ہے اگر آپ منظور کر لیں۔ عبداللہ نے کہا ضرور منظور کر لوں گا مگر بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟ کئیت نے کہا پہلے آپ فحجہ وعدہ کیجیے پھر بتاؤں گا غرض عبداللہ نے وعدہ کر لیا اور شاید قسم بھی کھالی۔ جیسے ہی انہوں نے وعدہ کیا، کئیت نے قبالہ واپس کر دیا اور کہہ دیا کہ میں قبالہ نہیں لے سکتا۔ ایک اور موقع پر بنی ہاشم نے کچھ روپے حج کر کے لے دینے چاہے، ہر ممکن تدبیر کی مگر اسے نہ لینے تھے نہ لیے اور صاف کہہ دیا کہ یہ قطعی ناممکن ہے کہ میں آپ سے روپے لوں۔

اس شخص نے اپنے اشعار اور اس نوع کی مرثیہ خوانی کی بدولت کیا کیا سختیاں نہیں جھیلیں، کیسی کیسی تکلیفیں نہیں اٹھائیں مگر اس کے پاتے استقامت کو ذرا جنبش نہیں ہوئی۔ آخر کار اسے پکڑ کر حاکم کوفہ یوسف بن عمر ثقفی کے گھر لے گئے، اس نے آٹھ آدمی اس کے بدن پر چر کے لگانے کے لیے مقرر کر دیے۔ جب اس کا دم آخڑ ہوا تو آخری الفاظ جو اس نے کہے یہ تھے:

اللَّهُمَّ اَلِ مُحَمَّدٍ ! اللَّهُمَّ اَلِ مُحَمَّدٍ !
 خُدايا اہلبیتؑ پیغمبر! خُدايا اہلبیتؑ پیغمبر!
 وعبیل بن علی خزاعی کو تو آپ جانتے ہیں، وہ کہتا تھا کہ میں پچاس سال سے خانہ بدوش ہوں۔“

ان مرثیہ گو شعراء کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ کیونکر لگایا جاسکتا ہے کہ جن کی تربیت خود ائمہ علیہم السلام نے کی ہو۔ یہ صرف مرثیہ گو اور مرثیہ خواں ہیں۔ یہ مرثیہ کہتے تھے لیکن ان کے مرثیوں میں نوحہ اور بکین نہیں تھا، وہ رزمیہ مرثیے کہتے تھے۔ ان کے قصیدے ایک انقلابی مفکر کے مقالاً کی طرح پُر اثر تھے۔ انھوں نے سید الشہداء امام حسینؑ کے زیر سایہ بی اہلیہ اور بنی عباس پر ایسی سخت تنقید کی کہ انھیں خون کے آنسو رلوا دیا۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ متوکل نے حکم دیا تھا کہ امام حسینؑ کی قبر کو زیر آب کر دیا جائے اور کسی کو ان کی قبر پر جانے کی اجازت نہ دی جائے، اگر کوئی وہاں جائے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور اگر کوئی حسینؑ بن علیؑ کا نام لے تو اسے سزا دی جائے۔

آپ ضرور سوچتے ہوں گے کہ متوکل کسی نفسیاتی الجھاؤ میں مبتلا تھا اور اس وجہ سے نام حسینؑ سے غیر معقول دشمنی اور بے سبب کینہ رکھتا تھا۔ نہیں جناب! یہ بات نہیں ہے۔

ائمہ اہلبیتؑ نے عواداری حسینؑ کے بارے میں جو تاکید کی تھی اس کے اثر اور کیفیت اور وعیل جیسے شاعروں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے امام حسینؑ کے نام میں وہ تاثیر پیدا ہو گئی تھی کہ ان کا نام ہی متوکل کے باپ کے زوال کا سبب بن گیا تھا۔ متوکل صاف دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے ہر شاعر اس پر ایک لشکر سے زیادہ بھاری ہے اور حسینؑ شہادت کے بعد ہی اس جیسے لوگوں کے منصوبے خاک میں ملانے کے لیے اتنے ہی کافی ہیں جتنے اپنی زندگی میں تھے۔

چونکہ ائمہ اہلبیتؑ کی اس ہدایت اور اس حکم نے کہ سید الشہداء کی

یاد کو قائم رکھا جائے، ان کے نام کو ظلم کے خلاف ایک نظریے اور ایک عقیدے کی شکل دے دی تھی اس لیے متوکل خوب سوچ سمجھ کر اس کے درپے تھا کہ اس نظریے اور اس عقیدے کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ امام کی یاد کسی طرح باقی رہے۔ ورنہ بہ لحاظ دیگر متوکل کافی ہوشیار آدمی تھا، تقدس کا لبادہ بھی اوڑھے ہوئے تھا اور ذاتی طور پر وہ امام حسینؑ کے بارے میں کسی نفسیاتی الجھاؤ کا بھی شکار نہیں تھا مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ مرثیہ خوانی نے ایک ایسے نظریے کی شکل اختیار کر لی ہے کہ اب متوکل، متوکل نہیں رہ سکتا۔

اور بھی بہت سے قصے ہیں، اگر ان کو جمع کر لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ سیدالشہداءؑ کے مرثیہ گو جب تک تعلیمات ائمہ علی پیروی کرتے رہے معاشرے میں ان کا کردار لائق صد تحسین رہا۔ ان باتوں کو اگر سمجھ لیا جائے اور ان کا سمجھنا ہے بھی ضروری، تو عواداری حسینؑ سے صحیح استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ پھر بھی میں یہ کہوں گا کہ باوجود تمام کوتاہیوں کے سیدالشہداءؑ کی نسبت آج بھی لوگوں کے جذبات و احساسات حقیقی اور پاک ہیں۔ اگر کچھ لوگ جن کی نیت بری نہیں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ عواداری کا مطلب غلط سمجھ لیا گیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بہتر ہے کہ اب اس قصہ کو ختم ہی کر دیا جائے کیونکہ لوگ محض اس لیے گریہ و بکا کرتے ہیں کیونکہ انھوں نے یہ سن رکھا ہے کہ اس طرح گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اگر یہ بات نہ ہو تو وہ قطعاً نہ روئیں لیکن یہ غلط فہمی ہے، حقیقت یہ نہیں۔ کسی کو لالچ دے کر رلا یا نہیں جاسکتا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو کچھ لوگوں کو جمع کر کے ان سے کہیے کہ کسی اور شخص کے لیے، مثلاً شاہ عباس کے لیے ذرا آدھ گھنٹہ بیٹھ کر روئیں تو ہم

ہر ایک کو ایک ہزار تومان دیں گے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے ؟
 رونے کے لیے احساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک آدمی متاثر
 نہ ہو اسے رونا نہیں آتا۔ آدمی اسی وقت رو سکتا ہے جب وہ غمگین ہو یا
 اس کے دل میں تڑپ ہو۔ سیدالشہداءؑ کی نسبت لوگوں کے جذبات
 واقعی ایک طرح سے حقیقی ہیں۔ لوگوں کو امام حسینؑ سے سچی محبت اور
 عقیدت ہے اور وہ دل سے ان کے لیے آنسو بہاتے ہیں۔ محرم اور صفر
 کے مہینوں میں ڈھیروں آنسو بہاتے جاتے ہیں۔ جب تک غم و اندوہ نہ
 ہو، عشق و محبت نہ ہو، احساسات و جذبات نہ ہوں رونا نہیں آتا۔ یہ
 جذبات قیمتی اور بڑے قیمتی ہیں، مگر ابھی تک ہم نے ان جذبات سے
 جیسا کہ چاہیے ویسا فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہم کیوں ان جذبات سے پورا
 فائدہ نہیں اٹھاتے، یہ ایک الگ بات ہے۔

ہمارے پاس بہت سی چیزیں ہیں جن سے ہم فائدہ نہیں اٹھاتے۔
 ہمارے یہاں دریائے کارون ہے جس سے ہم نے ابھی تک فائدہ نہیں اٹھایا
 تھا، تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ دریائے کارون کسی کام کا نہیں۔ صدیوں
 سے ہمارے یہاں زیر زمین تیل کے ذخائر تھے جن سے ہم نے فائدہ
 نہیں اٹھایا تھا۔ ہمارے ملک میں ہزاروں معدنی ذخائر تھے اور ہیں
 جن سے ہم فائدہ نہیں اٹھا رہے۔

اگر ہمارا ملک چاہتا ہے کہ وہ خوشحال ہو اور جادۂ ترقی پر آگے
 بڑھے، یہاں تعلیمی اور صنعتی لحاظ سے پیش رفت ہو، حریت و آزادی کی
 راہ پر لگے تو بہترین اور آسان طریقہ یہ ہے، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ واحد طریقہ
 یہ ہے کہ سیدالشہداءؑ کے بارے میں لوگوں کے سچے جذبات سے استفادہ

کیا جائے۔ یہ جذبات حقیقی ہیں اور ایک ہستی کے بارے میں ہیں جو قرار واقعی ان کی مستحق ہے اور جس کا پیش کردہ نظریہ بہت بلند اور عظیم ہے۔ ہم اپنے دین و مذہب کی ہدایت پر کیوں عمل نہ کریں، یہ تو بڑی اچھی ہدایت ہے جس پر ضرور عمل کرنا چاہیے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ بہر حال خطبہ و منبر کا جو ہمارے یہاں رواج ہے وہ نتیجہ ہے کہ بلا کے اندر ہنناک واقعہ کا اور اس کا کہ ائمہ اطہارؑ نے عزاداری سید الشہداءؑ کی تاکید فرمائی ہے۔ یہ عزاداری ہی کی برکت ہے کہ مجالس میں فہمیدہ اور متدین اشخاص تقریریں کرتے ہیں۔

اب چونکہ سید الشہداء کے نام پر مجالس ترتیب دی جاتی ہیں اور انہی کے نام پر لوگ جمع ہوتے ہیں تو کیوں نہ ہم اس موقع سے ایک اور فائدہ اٹھائیں اور کیوں نہ ضمناً ایک اور اصول پر بھی عمل پیرا ہوں؟ وہ اصول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے۔ اس طرح امام حسینؑ کے دو منبر ہوں گے: ایک منبر تو مرثیہ خوانی اور مظلوم کی حمایت اور ظالم کی نفی میں اظہار جذبات کا، جس کا اگر صحیح استعمال ہو تو وہ تمام عظیم آثار مرتب ہوں گے جن کا میں نے پیشتر ذکر کیا اور دوسرا منبر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا۔

ہمارے ملک میں رشد و ہدایت کا جو سلسلہ جاری ہے اور جو کچھ زبانی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا ہے وہ سب حسین بن علیؑ ہی کے

لہ ایلان میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے یہی نعرہ بلند کیا گیا تھا:

نہضتِ ماحسنیؑ ، رہبیرِ ماحسنی

مقدس نام کے طفیل سے ہے۔ یہ نہایت مناسب طریقہ اور بہت مستحسن رواج ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ منبر حسینؑ سے ضمناً کچھ نہ کچھ امر بالمعروف اور اصول و فروع دین کی تعلیم کا کام لیا جاتا ہے اور حسین بن علیؑ کے بارے میں لوگوں کے جو حقیقی جذبات ہیں ان سے قدرے استفادہ کیا جاتا ہے۔

جس قدر لوگ حسین بن علیؑ کے نام پر جمع ہو جاتے ہیں، اتنے کسی

اور کے نام پر جمع نہیں ہوتے، اس لیے یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ اس

طرح کا دستور موجود ہے۔ اب یہ کہ اس پر کس طرح عمل ہوتا ہے، یہ موقوف

ہے ذاکر کی اپنی لیاقت اور قابلیت پر اور اس پر کہ وہ عقائد اور اصول

دین بیان کر سکتا ہے، لوگوں کو پند و نصیحت کر سکتا ہے، حرام و حلال سمجھا

سکتا ہے اور لوگوں کو ان کے دینی و دنیاوی مفاد سے آگاہ کر سکتا ہے

لوگ بہر حال حسین بن علیؑ کی برکت سے سنبھلنے کے لیے تیار ہیں۔ اب یہ

ذاکر پر ہے کہ اس میں ان حقائق کو بیان کرنے کی قابلیت ہے یا نہیں۔

جب یہ صورت ہے تو پھر یہ ضروری ہوا کہ اس معاملے پر مناسب

غور و فکر کر کے ہر دو پہلو سے اس کی اصلاح کی تدبیر کی جائے۔ مرثیہ خوانی

کے پہلو سے بھی اور لوگوں کی ہدایت و ارشاد کے پہلو سے بھی۔

جہاں تک مرثیہ خوانی کا تعلق ہے مرثیہ خواں حضرات کو چاہیے کہ

سید الشہداءؑ کی تحریک کی حقیقی روح اور اس کے مقصد کی طرف توجہ

دیں اور ان احکامات و ہدایات کی علتِ غائی کو ذہن میں رکھیں جو ائمہ اطہارؑ

نے عزا داری کے بارے میں دی ہیں۔ چونکہ یہ ہدایات بلاوجہ نہیں دی گئیں

اس لیے ان حضرات کو چاہیے کہ تحریک کو بلا کے مقصد اور عزا داری سید

الشہداءؑ کے فلسفہ سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ یہ بات ایک دو بار نہیں سیکھ کر

بار، بلکہ ہمیشہ لوگوں کے کانوں میں پڑتی رہنی چاہیے، اس لیے ضروری ہے کہ ذاکرین خود صاحب بصیرت ہوں، ان کی معلومات چند پیش پا افتادہ جنگ ناموں تک محدود نہ ہوں اور وہ خود ساختہ لسان الذاکرین اور صدرالواعظین نہ ہوں۔ یہ لوگ بہت سی باتیں ایک دوسرے سے سن کر نقل کرتے رہتے ہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ فلاں بات کہاں سے معلوم ہوئی تو جواب ملتا ہے کہ فلاں لسان الذاکرین نے بیان کی ہے۔ مطلب یہ کہ کسی کتاب میں نہیں دیکھی، محض ادھر ادھر سے سنی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے لطیفے ہیں۔ اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میں آج ان میں سے کچھ آپ کو سناتا جس سے آپ کو معلوم ہوتا کہ جھوٹ جو کوئی ایک شخص گھڑتا ہے بس تیزی سے پھیلتا ہے اور کس طرح ایک دوسرے سے ہوتا ہوا ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جا پہنچتا ہے۔ ضروری ہے کہ تاریخی واقعات صرف معتبر تاریخی کتابوں سے معتبر مورخین کے قول کے مطابق نقل کیے جائیں۔

ہمارے یہاں ایک مورخ ڈاکٹر آیتی ہیں (جامعہ تعلیمات اسلامی کی شائع کردہ کتاب "تاریخ عاشورا" کے مصنف ڈاکٹر محمد ابراہیم آتی مرحوم) جن کو صدر اول کی تاریخ پر عبور ہے۔ میں جرات کر کے کہہ سکتا ہوں کہ شاید پورے تہران بلکہ تمام ملک میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کو صدر اسلام کی تاریخ پر ایسا عبور ہو جیسا انھیں ہے، کوئی اور شخص ایسا نہیں ہے جسے تاریخ کے اس دور کے متعلق ایسی تفصیلی معلومات ہوں جیسی انھیں ہیں۔ ان صاحب کو اس دور سے متعلق تمام تاریخی کتابوں اور تاریخی جزئیات پر ایسا کامل عبور ہے کہ شاید و باید۔ مثلاً اگر آپ جنگ بدر

کے بارے میں ان سے کچھ پوچھیں تو وہ اس جنگ میں شریک ایک ایک آدمی کے بارے میں تفصیل سے بتا سکتے ہیں بلکہ بسا اوقات وہ یہ بھی بتا دیں گے کہ فلاں شخص جو جنگِ بدر میں شریک تھا اس کا باپ کون تھا، ماں کون تھی، اعزہ اور اقربا کون تھے، وغیرہ۔ جو بات یہ صاحب کہتے ہیں سند ہوتی ہے لیکن اب اس کا کیا علاج کہ آپ اہل تہران کو تحقیقی بات سننے کی عادت ہی نہیں۔ ان صاحب کی تازہ ترین تصنیف جس کو یونیورسٹی نے شائع کیا ہے اندلس کی تاریخ کے بارے میں ہے اور اس کا نام بھی ”تاریخ اندلس“ ہے۔ اس میں تاریخ اسلام کے ایک ایسے حادثہ فاجحہ کا ذکر ہے جس کے بارے میں ہم مسلمانوں خصوصاً ایرانیوں نے بڑی کوتاہی سے کام لیا ہے۔ یہ کتاب پڑھنے کی ہے، ضرور پڑھیے! بہر حال! ذکر یہ تھا کہ قیامِ حسینی کا مقصد اور عہدِ اداری کا فلسفہ

منبروں سے بار بار بیان ہوتے رہنا چاہیے تاکہ وہ قائد مرتب ہو اور وہ مقصد حاصل ہو جس کے لیے امام زین العابدینؑ، امام باقرؑ، امام صادقؑ اور امام کاظمؑ عہدِ اداری کی تلقین کرتے رہے تھے تاکہ کمیت اور عمل جیسے شاعر پیدا ہوں اور ان کے مرثیوں سے وہی پہلے جیسے نتائج برآمد ہوں۔ کوئی ایسا کام ہرگز نہیں کرنا چاہیے جس سے جذبات سرد پڑ جائیں بلکہ وہ کام کرنا چاہیے جس سے جذبات میں اور بھی شدت پیدا ہو۔ حتیٰ و صداقت سے لوگوں کی محبت اور باطل سے نفرت میں اضافہ ہو۔

مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کہہ رہا ہے یہ ارے کون بہ اندازِ سروش
کہ بس امروز ہے امروز، نہ فردا ہے نہ دوش

کس کی یارب یہ صدا ہے کہ فضا ہے خاموش
 میں حسینؑ بن علیؑ بول رہا ہوں اے جوش!
 بخش دے آگ مرے سرد عواداروں کو
 ہاں! جگا ڈاب میں سوئی ہوئی تلواروں کو



اے قوم! وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ
 اسلام ہے پھر تیسرے حوادث کا نشانہ
 کیوں چُپ ہے؛ اُسی شان سے پھر پھیرا ترانہ
 تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ
 مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
 لازم ہے کہ ہر فرد حسینؑ بن علیؑ ہو



حق و باطل کا معرکہ دنیا میں ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ لہے گا،
 موسیٰؑ اور فرعون ہمیشہ دنیا میں لہے ہیں، ابراہیمؑ اور نمرود ہمیشہ دنیا میں
 لہے ہیں، محمدؐ اور ابو جہل ہمیشہ لہے ہیں، علیؑ اور معاویہ دنیا میں ہمیشہ
 لہے ہیں، حسینؑ اور یزید ہمیشہ لہے ہیں۔
 موسیٰؑ اور فرعون و شعیبؑ و یزید
 این دو قوت از حیات آمد پدید
 اقبال

لہ زیر بحث مضمون کی مناسبت سے ان اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے۔

مقصد یہ نہیں ہے کہ ابراہیمؑ، موسیٰؑ، محمدؑ، علیؑ اور حسینؑ کے مرتبہ کے لوگ ہمیشہ رہے ہیں بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ حق اور باطل ہمیشہ برسرِ پیکار رہے ہیں۔ معاشرے کے سامنے ہمیشہ دو راستے رہے ہیں، ایک حق کا اور دوسرا باطل کا۔ یہ مجلس و مرثیہ کا ایک رُخ ہے۔

دوسرا رُخ ہے ارشاد و ہدایت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا۔ اس بارے میں کیا کرنا چاہیے اور اس پر عمل کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟ میرا خیال ہے کہ اس طریقہ کار پر عمل کرنا چاہیے جو خطبہ جمعہ کے بارے میں ہمارے لیے تجویز کیا گیا ہے اور جس کے متعلق میں نے کل رات ایک روایت امام رضاؑ سے نقل کی تھی۔ یہ فرمان بہت جامع ہے۔ لیکن ہمارے یہاں جمعہ کی نماز تو ہوتی نہیں کہ اس ہدایت پر جمعہ کے خطبوں میں عمل کیا جائے۔ اس لیے ان ہی خطبوں اور تقریروں میں اس پر عمل کیا جاتے جو حسینؑ، علیؑ کی برکت سے ہمارے یہاں رائج ہیں۔

امام ثامن حضرت رضاؑ کی جو روایت میں نے کل رات بیان کی تھی اس میں خطیب کے فرائض کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔
پہلے حصے کے بارے میں فرمایا گیا ہے :

لے الحمد للہ شاہ ایران کی طاغوتی حکومت کے خاتمے کے بعد ایران کے ہر شہر میں نماز جمعہ کے فقیہ المثال اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔ صرف تہران میں چالیس سے پچاس لاکھ افراد بیک وقت ایک جگہ جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں۔ آج کے ایران میں دیواروں پر لٹمینی کا یہ جملہ لکھا نظر آتا ہے۔

نماز جمعہ یک نماز عادی نیست

”إِنَّمَا جُعِلَتِ الْخُطْبَةُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ لِأَنَّ
الْجُمُعَةَ مَشْهُدٌ عَامٌّ فَأَرَادَ أَنْ يَكُونَ لِلْأَمِيرِ
سَبَبٌ إِلَى مَوْعِظَتِهِمْ وَتَرْغِيبِهِمْ فِي الطَّاعَةِ
وَتَرْهِيْبِهِمْ مِنَ الْمَعْصِيَةِ.

یعنی جمعہ کا دن ایسا ہے کہ سب لوگ جمع ہوتے ہیں
اور مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع ترتیب پاتا ہے۔ اسلام
چاہتا ہے کہ اس موقع پر مسلمانوں کا رہنما وعظ کہے ،
اطاعت خداوندی کی ترغیب دے اور گناہوں سے مستنبہ
کرے۔“

کوئی فرد واحد بھی ایسا نہیں جسے وعظ و نصیحت کی حاجت نہ ہو
یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو کسی دوسرے سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو
مگر وعظ و نصیحت سے کوئی بے نیاز نہیں کیونکہ کسی بات کا جاننا اور بے
اور کسی مومن و متقی واعظ کی تلقین سے اثر پذیر ہونا اور بات ہے کہتے
ہیں امام علیؑ اپنے اصحاب میں سے کسی سے فرماتے تھے کہ ”مجھے نصیحت کرو“
اور آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ ”سننے میں جو اثر ہے وہ جاننے میں نہیں“
ضروری ہے کہ ہمیشہ کچھ لوگ جو اس کام کی صلاحیت و استعداد
رکھتے ہیں لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہیں، ان کو خدا کی یاد دلاتے ہیں
موت سے غافل نہ ہونے دیں اور انھیں گناہوں کے نتائج و عواقب سے ڈراتے
رہیں، قبر و قیامت کا تذکرہ کرتے رہیں، لوگوں کو عدل الہی کی طرف متوجہ
کرتے رہیں۔ یہ ضروری باتیں ہیں، معاشرہ کبھی ان سے بے نیاز نہیں
ہو سکتا۔ گزشتہ زمانے میں ہمارے یہاں اچھے بچھے واعظ ہوتے ہیں اور

بِحَمْدِ اللّٰهِ اب بھی ہیں جتنے زیادہ باصلاحیت اور جامع الشرائط واعظ ہوں
 بہتر ہے۔ خطبہ رومنبر کے سلسلے میں اس کام کا ہونا بھی ضروری ہے
 خطیب کے فرائض کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کے متعلق امامؒ نے فرمایا:

”وَتَوْقِيْفِهِمْ عَلٰی مَا اَرَادَ مِنْ مَّصْلَحَةٍ
 دِيْنِهِمْ وَدُنْيَاهُمْ .“

یعنی خطیب کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو ان باتوں
 سے آگاہ کرے جو ان کے دینی اور دنیاوی مفاد میں
 ہوں اور یہ بتائے کہ موجودہ حالات میں انہیں کیا کرنا
 چاہیے اور ان کی دینی اور دنیاوی مصلحتوں کا اقتضا
 کیا ہے۔“

ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا کام ہے اور پند و نصیحت اور عام وعظ
 سے بہت زیادہ مشکل ہے۔ عام وعظ کی تو یہ بات ہے کہ اگر کوئی شخص
 اہل ایمان ہے، باعمل ہے، پُرْخُلُوص ہے تو اگر اسے وعظ کے چند کلمات
 بھی کہنے آتے ہیں تو وہ وعظ کر سکتا ہے اور ایک حد تک اس کا وعظ
 مفید بھی ہوگا۔ اگر آدمی باعمل اور پُرْخُلُوص ہو تو یہ بھی کافی ہے کہ
 بزرگوں کے کچھ اقوال ہی بیان کرے لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ دینی اور
 دنیاوی مصالح عالیہ بیان کرے اور ان سے لوگوں کو آگاہ کرے تو یہ بڑا
 کٹھن کام ہے۔

اس کام میں دو دشواریاں ہیں: ایک تو یہ کہ اس کے لیے بڑی
 وسیع معلومات درکار ہیں۔ دوسرے خلوص بہت ضروری ہے تاکہ دین

دنیا کی جو مصلحتیں وہ سمجھتا ہے وہ صاف صاف دُوسروں کو بتلا سکے۔
 جہاں تک معلومات کا تعلق ہے تو دین کے اصول و مبانی سے
 کافی واقفیت ہونی چاہیے، اسلامی تعلیمات کی رُوح سے آگاہی ہونی
 چاہیے۔ اسلام کے ظاہر و باطن اور پوست و مغز میں تمیز کی صلاحیت
 ہونی چاہیے تاکہ وہ دینی مصلحتوں کو سمجھ سکے اور بیان کر سکے۔ صرف
 عام دینی معلومات اس مقصد کے لیے کافی نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے
 لیے معاشرے کو سمجھنا بھی ضروری ہے اور یہ جاننا بھی کہ دُنیا میں کیا ہو
 رہا ہے اور موجودہ حالات میں اسلامی معاشرے کی مصاحت کا تقاضا کیا
 ہے تاکہ وہ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور اسلامی معاشرے کے
 مفاد سے لوگوں کو روشناس کرا سکے۔

مقامِ افسوس ہے کہ وعظ کا یہ پہلو ہمارے ہاں کمزور ہے۔ ^{عظ}
 بہت ہیں اور وعظ کے دوسرے پہلو کمزور نہیں یا کم از کم بہت کمزور نہیں
 مگر یہ پہلو بہت کمزور ہے کیونکہ مطالعہ کی بہت کمی ہے۔ امامِ رضاؑ
 کا ارشاد بہت زیادہ ارزش رکھتا ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ لوگوں کو
 دین و دُنیا کی مصاحت سے آگاہ کرو۔ جس شخص کو صرف کسی خاص
 علم مثلاً فقہ، ادب یا فلسفہ کی چند کتابوں سے سروکار رہا ہو اور جس
 نے مدرسہ کے ایک کونے میں زندگی گزاری ہو وہ نہیں سمجھ سکتا کہ معاشرہ
 کی کیا حالت اور کیا ضرورت ہے۔ مدرسہ کے کونے میں بیٹھ کر کوئی
 معاشرے کے مفاد پر نظر نہیں رکھ سکتا۔ دُنیا کے بدلتے ہوئے حالات
 کا علم بھی بہت ضروری ہے۔ یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ آئندہ کیا
 پیش آنے والا ہے اور معاشرے کو ان سے کس طرح نبٹنا چاہیے تاکہ

کسی خطرے کا سامنا نہ کرنا پڑے، بڑی تیز جس کی ضرورت ہے۔ پیش
پیشی کی صلاحیت کے بغیر ہدایت و رہنمائی کا کام ممکن نہیں۔

ہدایت کا کیا مطلب ہے؟ ہدایت کے معنی ہیں رہنمائی۔ کوئی
قافلہ کسی منزل کی طرف چلا جا رہا ہو تو راستے میں کسی سے پوچھتے ہیں کہ
فلاں منزل کی طرف کونسا راستا جاتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ”اس طرف جاؤ۔“
یہ رہنمائی ہے۔ قافلے کا رہنما کون ہو سکتا ہے؟ صرف وہی جو سمجھتا ہو
کہ قافلہ کس راستے پر ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ معاشرہ بھی ایک قافلہ
ہی کی طرح ہے جو ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں یہ
قافلہ رواں دواں ہے۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ اس قافلے کو کس سمت میں
لے جایا جائے۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ موٹر ڈرائیور گاڑی چلا رہا ہے، اس حالت
میں اسٹیرنگ وہیل اس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ کہیں اسے گاڑی بند کرنے
یا ٹھیرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور کہیں گاڑی کی رفتار تیز کرنے اور بڑھانے
کی، کسی جگہ اسٹیرنگ وہیل گھمانا پڑتا ہے، کہیں گیمبر بدلنا ہوتا ہے اور
کہیں بریک لگانا۔ یہ سب باتیں گاڑی کو صحیح چلانے کے لیے ضروری ہیں۔
یہی حال معاشرے کا ہے، اسے بھی صحیح سمت میں چلانے کے لیے یہی کچھ
کرنا پڑتا ہے۔ کبھی اس کا رخ موڑنے کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی تیسرے
چلانے کی اور کبھی ٹھیرنے کی۔ ہر کام وقت معین پر کرنا ہوتا ہے۔ اسے
ہی معاشرے کی مصلحت کو سمجھنا کہتے ہیں۔ جو شخص یہ بات نہیں سمجھتا
وہ معاشرے کا ہادی اور رہبر نہیں بن سکتا اور نہ معاشرے کی مصلحت
اور مفاد کے بارے میں گفتگو کر سکتا ہے۔

ہم معاشرے کے ہادی و رہبر اسی وقت بن سکتے ہیں جب ان سب باتوں کو سمجھیں اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ کس وقت کیا کرنا چاہیے ، کہاں معاشرے کو بریک لگانا چاہیے اور کہاں اس کا رخ موڑنا چاہیے۔ معاشرہ رواں دواں ہے، بیچ و خم آتے رہتے ہیں، کبھی کبھی معاشرتی موڑ آجاتے ہیں اور معاشرہ ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں بہت احتیاط سے گھومنا پڑتا ہے۔

ہمارا معاشرہ بھی اس وقت کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہے ایک نیا تمدن ابھر رہا ہے، نئے نئے نظریے اور نئے نئے خیالات پیدا ہو رہے ہیں، ہمارے سامنے رکاوٹیں ہیں اور ہمیں بہت احتیاط سے چلنا ہے تاکہ ہم سہولت سے اور بے خطر اس موڑ سے گزر جائیں۔ اسٹیئرنگ بہت آہستہ گھمانے کی ضرورت ہے تاکہ کوئی خطرناک صورت حال پیدا نہ ہو۔ سامنے دیوار ہے، اس دیوار سے بچ کر اپنے راستے پر جانا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آنکھیں بند کر کے اسی طرح چلتے رہیں جیسے پہلے چل رہے تھے۔ پہلے دیوار نہیں تھی، اب دیوار ہے۔ پہلے رکاوٹ نہیں تھی اب رکاوٹ ہے۔ دریا آ گیا ہے۔ ہم پہاڑ کے درہ پر پہنچ گئے ہیں۔ بہر حال یہ معاشرے کے رہنما کا کام ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کرے کہ منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے معاشرے کو کہاں مڑنا ہے اور کس نئے راستے پر چلنا ہے۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رفتار کہاں بڑھانی ہے۔ آج دنیا میں کوس بن گئی ہے، سب کوشش کر رہے ہیں کہ دوڑ جیت لیں اور آگے نکل جائیں اس لیے رفتار تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ آج علم اور صنعت کی دوڑ ہے، ایسے میں ضروری ہے کہ معاشرے کو حرکت میں لایا جائے تاکہ وہ دوڑ میں

پیچھے نہ رہ جائے۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ بیٹھے بیٹھے نکتہ چینی اور اعتراض کرنے کا نام رہنمائی اور ہدایت نہیں۔

ایک روز میں نے مدرسہ مروی میں چند طلبہ سے اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہادی قوم ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ہم لوگوں کو منع کرنے ہی کا کام اختیار کر لیں۔ جب بھی کوئی بات ہو یہی کہے جائیں یہ مت کرو، وہ مت کرو اور اسی طرح لوگوں کو ایک مصیبت میں مبتلا کر دیں۔ کبھی کبھی لوگوں کی ہمت افزائی بھی کرنی چاہیے اور لوگوں کو کام پر آمادہ کرنا چاہیے۔ میں نے یہی موٹر گاڑی کی مثال دی اور کہا کہ ہمیں موٹر ڈرائیور کی طرح کبھی رفتار تیز کرنی چاہیے کبھی اسٹیئرنگ وہیل گھمانا چاہیے کبھی بریک لگانا چاہیے اور کبھی تیز روشنی جلانی چاہیے۔ ہر موقع کا اپنا ایک اقتضار ہے۔ پھر میں نے مذاقاً کہا کہ ہمیں مسٹر بریک نہیں بتے رہنا چاہیے کہ ہر جگہ بس بریک ہی لگاتے رہیں۔ محض بریک لگانا کافی نہیں ہے، کبھی مسٹر اسٹیئرنگ اور کبھی مسٹر گیئر بھی بن جانا چاہیے۔ اس پر ایک طالب علم نے کہا ”ہم تو کچھ بھی نہیں، صرف ریورس گیئر ہیں“

بہر حال مختلف مواقع کو سمجھنے کے لیے وسیع علم اور زیادہ معلومات کی ضرورت ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ یہ سمجھے کہ مورچہ کہاں ہے، موچے پر قبضہ کرنا چاہیے جو موقع ملے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

إِنَّ لِرَبِّكُمْ فِي أَيَّامٍ دَهْرِكُمْ نَفَحَاتٍ أَلَا
فَتَعَرَّضُوا لَهَا .

یعنی اللہ کی رحمت کی ہوا میں کبھی کبھی چلتی ہیں،

اللہ کی رحمت کی مثال اس نسیم خوشگوار کی سی ہے جس کے متعلق معلوم نہیں ہوتا کہ کب آئے گی۔ چوکنے رہو تاکہ اس بادِ بہاری کے جھونکے جب بھی آئیں ان سے قایم رہو اٹھا سکو۔“

اچھے اور مناسب موقع کی مثال زود گزر ہوا کے جھونکے کی سی ہے جو آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ اگر ہاتھ سے نکل جاتے تو پھر اسے پکڑنا نہیں جاسکتا۔ افسوس ہماری حالت پر کہ ہم موقع گنوا رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں مادہ پرست اور گمراہ لوگ جنہوں نے اپنے مسلک پر مذہب کا لیبل لگا رکھا ہے کس قدر چالاک ہیں کہ وہ ایک معاشرتی چوکی کے بعد دوسری چوکی اور ایک مورچہ کے بعد دوسرا مورچہ ہمارے ہاتھ سے پھینکتے اور جتنی اس مرکز پر قبضہ کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح اپنا مقصد حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مگر ہمارا یہ حال ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ ”یہ مت کرو، وہ مت کرو، بریک لگاؤ بریک“ اور اس کارنامے پر بہت خوش اور مطمئن ہیں۔

اس فقہ سے :

وَتَوْقِيْفُهُمْ عَلَىٰ مَا أَرَادَ مِنْ مَّصْلَحَةٍ دِيْنِيَّةٍ
وَدُنْيَا هُمْ .

مُرَادِ يَرْهَبُ كَمَا لَوْ كَانَتْ دِيْنِيَّةً اَوْ دُنْيَا وَاي مَصْلَحَتٍ سَعَاةً

کیا جائے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا اس کے لیے دو شرطیں ہیں: علم اور خلوص۔ دین کے لیے بھی علم کی ضرورت ہے اور دُنیا کے لیے بھی۔ واعظ

کو دین شناس بھی ہونا چاہیے اور دنیا کے حالاتِ حاضرہ اور معاشرتی واقعات
تعمیرات اور موجودہ رجحانات سے بھی باخبر ہونا چاہیے۔

تا راہ میں نباشی تو کے راہبر شوی!

جہاں تک خلوص کا تعلق ہے حاجی نور علی الرحمہ نے ایک کتاب
لکھی ہے جس کا نام ”نور و مرجان“ ہے۔ میں نے اس کتاب کا نام تو سنا
تھا مگر پڑھی اسی سال ہے۔ یہ کتاب مرثیہ خوانی اور مرثیہ خواں حضرات
کے بارے میں ہے، اس کا وعظ و خطبہ اور واعظ و خطیب حضرات سے
کوئی تعلق نہیں ہے۔ انھوں نے مرثیہ خوانی کے لیے دو شرطیں بیان کی ہیں
ایک اخلاص اور دوسرے راست گوئی۔ ان دونوں نکتوں پر بلند پایہ بحث
کی ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جب میں نے یہ کتاب پڑھی تو مجھے بہت
پسند آئی اور حاجی نور علی سے میری عقیدت میں اضافہ ہو گیا۔ حاجی نور علی
محدث، بڑے پابند شریعت اور متقی شخص تھے اور مرحوم حاجی شیخ عباس
قمی اعلیٰ اللہ مقامہ کے استاد تھے۔ خود شیخ عباس اور کسی دوسروں
نے اعتراف کیا ہے کہ اتباع شریعت میں وہ اس درجہ تک نہیں پہنچ سکے
جس درجہ پر ان کے استاد تھے۔ میں حاجی نور علی کی اہم کتابیں پڑھ چکا
تھا اور پہلے سے ان کا عقیدت مند تھا مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ اس
چھوٹی سی کتاب کو پڑھنے کے بعد ان سے میری عقیدت میں مزید اضافہ
ہو گیا۔ اس کتاب کے مقدمہ میں وہ ایک ہندوستانی عالم کا نام بڑی ہمت
کے ساتھ لیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان صاحب نے مجھے خط لکھا اور اس
میں ہندوستان میں مجلس و منبر کی جو صورت ہے اس کی شکایت کی اور
لکھا کہ ”یہاں کے مرثیہ خواں زیادہ تر جھوٹے قصے بیان کرتے ہیں۔“ حاجی

نوری کہتے ہیں کہ ان ہندوستانی عالم نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس سلسلے میں ایک کتاب لکھوں تاکہ ان لوگوں کی دروغ گوئی کا سدباب ہو سکے۔ حاجی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ شاید ان ہندوستانی عالم کا خیال تھا کہ صرف ہندوستان ہی کے روضہ خواں جھوٹے قصے سناتے ہیں، اوراق و ایران میں ایسی دروغ گوئی نہیں ہوتی ہوگی اور وہاں صحیح و معتبر روایات ہی بیان ہوتی ہوں گی۔ انھیں معلوم نہیں کہ جھوٹ کی اشاعت کا مرکز تو یہیں ہے اور یہیں سے جھوٹے قصے ہندوستان پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد حاجی نوری کہتے ہیں کہ یہ سب تصور علماء کا ہے جو ترقی اور اعتراض نہیں کرتے۔ اگر اہل علم سہل انگاری سے کام نہ لیتے، ان لوگوں کے صدق و کذب پر نگاہ رکھتے اور انھیں آکا ذیب بیان کرنے سے روکتے تو خرابی اس حد تک نہ پہنچتی، یہ لوگ اس قدر جری اور بے باک نہ ہو سکتے، اس طرح کے واضح جھوٹ نہ پھیلا سکتے۔ مذہب حقہ انامیہ اس قدر تضحیک و استہزاء کا ہدف نہ بنتا، مجالس اتنی بے رونق اور بے برکت نہ ہوتیں۔

بہر حال اپنے موضوع پر کتاب نہایت عمدہ ہے۔ تعجب ہے کہ اس کتاب کو وہ مقبولیت کیوں حاصل نہیں ہوتی، جس کی یہ مستحق ہے۔ اس کتاب میں حاجی نوری نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی دو شرطیں بیان کی ہیں: اخلاص اور صدق۔ دونوں پر خوب بحث کی ہے۔ خصوصاً صدق و راستی اور جھوٹ کے اقسام پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اخبار اور احادیث پر کس قدر عبور ہے۔ میں نے اس موضوع پر اس قدر مفصل بحث اب تک نہیں اور نہیں دیکھی۔

اخلاص پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے اُہرت اور معاوضہ لے کر

روضہ خوانی پر گفتگو کی ہے۔ اخلاص سے مراد یہ ہے کہ کوئی عمل محض خدا کی رضا کے لیے کیا جائے، دوسری کوئی غرض شامل نہ ہو۔
 غیر از خدا کے لیے عمل کی بھی کئی قسمیں ہیں: ایک تو یہی کہ روپیہ کمانا مقصود ہو۔ اور بھی چند اقسام ایسی ہیں جن کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں، میری نظر میں ان کی اہمیت اُجرت اور معاوضہ لینے سے بھی زیادہ ہے اور یہ اور بھی زیادہ خطرناک ہیں۔

ان اقسام میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی شخص خطابت کی کرسی یا حسین بن علیؑ کے منبر پر بیٹھ کر دین کی تبلیغ کی بجائے کسی شخصیت کی دلائل شروع کرے اور منبر کو شخصیتوں کی دلائل کا ذریعہ بنالے۔ بد قسمتی سے اس قسم کی چیز ہمارے معاشرے میں موجود ہے اور منبروں کا غلط استعمال ہوتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جس شخصیت کی دلائل کی جا رہی ہے وہ کوئی سیاسی شخصیت ہے یا روحانی یا کوئی اور۔ دلائل بانی مجلس ہے، پیش نماز ہے یا پیش نماز سے اُنچے درجے کا کوئی شخص۔ ایسی حرکتیں منبر کی حیثیت اور مرتبے سے فزودر اور اس کے خلاف ہیں۔ ویسے ظاہر ہے کہ جو شخص کوئی کام کرتا ہے وہ اس کی کوئی توجیہ اور تاویل تو گھڑ لیتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جن چیزوں نے منبر خطابت کو بے وقعت اور خراب کیا ہے ان میں سے ایک یہی دلائلی ہے۔ اس کی فوج سے منبر دلائل کی کرسی بن گیا ہے جسے اس آلودگی سے پاک کرنا ضروری ہے۔
 ایک اور بات یہ ہے کہ اگر وَتَوْفِيهِمْ عَلَىٰ مَا أَرَادَ مِنْ مَّصَلٰتٍ دِيْنِهِمْ وَدُنْيَا لَهُمْ كَمِصْدَاقِ دِيْنِيْ اور دُنْيَاوِي مَصٰلِكًا كَمَا بَيَانَ مَقْصُوْدًا ہو تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مصلحت گوئی اور بات ہے اور دلچسپ باتیں کرنا

اور چیز۔ مصلحت گوئی کے یہ معنی نہیں کہ ہم وہ کچھ کہیں جو لوگوں کو پسند آتے اور وہ ہماری واہ واہ کریں۔

شاید آپ کو معلوم ہو کہ لوگ اپنے زمانے کے پیغمبروں کے مخالف کیوں تھے؟ جو پیغمبر بھی آیا اس کی اتنے زیادہ لوگوں نے مخالفت کیوں کی؟ تو وہ پیغمبروں کے زمانے میں ان کے مُتَقِدِّین کی تعداد کم کیوں رہی؟

اس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ انبیاء لوگوں کی کمزوریوں اور خرابیوں کے خلاف جدوجہد کرتے تھے اور ہم لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کمزوریوں اور بُرائیوں کی اصلاح کریں، ہم چاہتے ہیں کہ ان بُرائیوں اور کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں ہم ان کے نفع کی بات نہیں کرتے بلکہ بانیِ مجلس اور سامعین کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ان کی مصلحت کے مطابق بات نہیں کرتے بلکہ ان کے رجحان کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں قصہ محض جھوٹ ہے اور علاوہ انہیں لوگوں کو گمراہ کرے گا مگر سامعین کو لبھانے کے لیے اس کو بیان کر دیتے ہیں۔

مثلاً باوجود اس کے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ حکایت من گھڑت ہے اور افسانہ طرازوں کے تخیل کی ایجاد ہے، پھر بھی نقل کرتے رہتے ہیں کہ:

”ایک عیسائی جو بہت گنہگار تھا اور جس میں بیخ عیب شرعی موجود تھے، کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ زائرینِ کربلا کے ساتھ ہولیا۔ جب سب شہر کے دروازے پر پہنچے تو اور لوگ تو سواروں سے اتر کر زیارت کے لیے روانہ ہو گئے البتہ عیسائی چونکہ غیر مسلم تھا دروازہ کے باہر ہی ٹھہر گیا اور سامان پر پرٹ کر سو گیا۔ زائرین کے قافلے آتے جاتے رہے اور قافلوں کا غبار اُڑا اُڑ کر

امام رضائے فرمایا :

وَيُخْبِرُهُمْ بِمَا وَرَدَ عَلَيْهِمْ مِنَ الْأَفَاقِ
مِنَ الْأَحْوَالِ الَّتِي فِيهَا الْمَضْرَّةُ وَالْمَنْفَعَةُ .

دُور دراز کے علاقوں کے وہ حالات جو عوام کو معلوم
نہ ہوں ان کو بتلائے جائیں۔

امام رضائے یہ بات نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہی ہے۔ یہیں یہ
معلوم ہونا چاہیے کہ امپریلسٹوں ، کمیونسٹوں اور یہودیوں کی سرگرمیاں کیا
ہیں اور ان سرگرمیوں کا بیان کرنا واجب ہے۔

منبر حسینؑ سے اگر یہ سب باتیں بیان کی جائیں تو اسے واقعی محافظ
اسلام کہا جاسکتا ہے۔ یہی عرادی حسینؑ کا فلسفہ ہے۔ ورنہ امام عالی مقامؑ
کو ہمارے رونے سے کیا فائدہ ؟ انھیں ہمارے اور آپ کے رونے کی کیا
ضرورت ؟

امام حسینؑ تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کا نام اور ان کا نظریہ زندہ رہے۔
ان کے نظریہ کے تحت ہم باطل سے نبرد آزما ہوں ، کمیونزم کے خلاف
جنگ کریں ، سامراجی اور صہیونی سازشوں کا قلع قمع کریں اور بلقان
پر عنوانی ، قیام بازی اور منکرات کے خلاف جہاد کریں۔

أَشْهَدُ أَنَّكَ قَدْ أَقَمْتَ الصَّلَاةَ وَآتَيْتَ

الزَّكَاةَ وَآمَرْتَهُ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَيْتَهُ عَنِ

الْمُنْكَرِ وَجَاهَدْتَهُ فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ .

کاش ! ایک بار پھر حسینؑ کا ذکر ، ان کا نام اور ان کی یاد میں

جنبش میں لائے !

يَا لَيْتَنَا كُنَّا مَعَكُمْ فَنَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا

”لے کاش کہ ہم بھی آپکے ہمراہ ہوتے اور آپ کے

ساتھ شہادتِ عظمیٰ پر فائز ہوتے!“

ایک ایسے سانحہ میں شرکت کی آرزو کہ جس کو اب چودہ سو سال

گزر چکے ہیں، بظاہر اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

یہ سب باتیں اس لیے ہیں کہ ہم مُسْتَعِدِّ اور مُتَعَهِّدِ رہیں۔ اور

سید الشہداءؑ کو ایک نظریے کی صورت میں زندہ رکھیں۔

شہیدِ کربلاؑ نہیں رہے مگر ان کا مکتب زندہ ہے اور ہمیں حسین

پر چم تلے ہی جدوجہد کرنی ہے اور راہِ حق میں قدم آگے بڑھانا ہے۔

گزشتہ رات بھی کیا رات تھی۔ اس میں حسینؑ بن علیؑ اور آپ

کے جاں نثار اصحاب پر کیا گزری؟ ان کے لیے یہ رات مسرت و شادمانی

کی شبِ درخشاں تھی۔

شبِ مردانِ خدا روزِ جہاں افروز است

روشناں را بحقیقت شبِ ظلمانی نیست

(مردانِ خدا کی رات بھی دن کی طرح درخشندہ و تابندہ

ہوتی ہے۔ درحقیقت روشن دلوں کی رات کبھی اندھیری

نہیں ہوتی)

گزشتہ رات، جیسا کہ میں نے عرض کیا، امام حسینؑ نے خود فرمایا

تھا کہ آج رات کی قہمت لے لو تاکہ میں یہ رات دُعا اور مُناجات میں گزار

سکوں۔ راوی کہتا ہے کہ

”اس رات عبید اللہ بن زیاد کے لشکر کا ایک دستہ جو

تیس افراد پر مشتمل تھا امام حسینؑ کے خیمے کے قریب سے گزرا تو انھیں کچھ آوازوں کی گونج سنائی دی۔ لشکری نزدیک آئے کہ دیکھیں کیا بات ہے۔ دیکھا تو دُعا و استغفار کی آواز بلند تھی۔

لَهُمْ دَوِيُّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ .

نجیام حسینؑ سے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز آرہی تھی۔ کوئی رکوع میں تھا اور کہہ رہا تھا سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ وَبِحَمْدِهِ کوئی سجدے میں تھا اور کہہ رہا تھا سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى وَبِحَمْدِهِ کوئی قرآن پڑھ رہا تھا، کوئی اللہ اکبر کہہ رہا تھا اور کوئی سُبْحَانَ اللَّهِ۔ لشکری یہ ماجرا دیکھ کر ایسے مسحور ہوئے کہ کہنے لگے کہ ہم سے غلطی ہو گئی، اب ہم ان کا ساتھ دیں گے۔“

مجھے معلوم نہیں اس رات اصحاب حسینؑ کچھ دیر سوئے بھی یا بالکل ہی نہیں سوئے، صبح تک عبادت ہی میں مشغول رہے، اپنے ہتھیار ضیق کیے، خیموں کی ترتیب بدلی اور ہر لحاظ سے لڑائی کی تیاری مکمل کر لی۔

صبح ہوئی تو امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کے ساتھ فجر کی نماز باجماعت پڑھی اور اس کے بعد ایک مختصر سا خطبہ دیا :

فَحَمْدَ اللَّهِ وَآثَنِي عَلَيْهِ وَقَالَ لِأَصْحَابِهِ
إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ آذَنَ فِي قَتْلِي وَقَتْلِكُمْ الْيَوْمَ.

يَا لَيْتَنَا كُنَّا مَعَكُمْ فَفَنُفُوزٌ فَوْزًا عَظِيمًا

”اے کاش کہ ہم بھی آپکے ہمراہ ہوتے اور آپ کے

ساتھ شہادتِ عظمیٰ پر فائز ہوتے!“

ایک ایسے سانحہ میں شرکت کی آرزو کہ جس کو اب چودہ سو سال

گزر چکے ہیں، بظاہر اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

یہ سب باتیں اس لیے ہیں کہ ہم مستعد اور مستعد رہیں۔ اور

سید الشہداءؑ کو ایک نظریے کی صورت میں زندہ رکھیں۔

شہیدِ کربلاؑ نہیں رہے مگر ان کا مکتب زندہ ہے اور ہمیں حسین

پر چم تلے ہی جدوجہد کرنی ہے اور راہِ حق میں قدم آگے بڑھانا ہے۔

گزشتہ رات بھی کیا رات تھی۔ اس میں حسینؑ بن علیؑ اور آپ

کے جاں نثار اصحاب پر کیا گزری؟ ان کے لیے یہ رات مسرت و شادمانی

کی شبِ درنشاں تھی۔

شبِ مردانِ خدا، روزِ جہاں افزو، راست

روشنایِ را بحقیقت شبِ ظلمانی نیست

(مردانِ خدا کی رات بھی دن کی طرح درخشندہ و تابندہ

ہوتی ہے۔ درحقیقت روشن دلوں کی رات کبھی اندھیری

نہیں ہوتی)

گزشتہ رات، جیسا کہ میں نے عرض کیا، امام حسینؑ نے خود فرمایا

تھا کہ آج رات کی فہمت لے لو تاکہ میں یہ رات دعا اور مناجات میں گزار

سکوں۔ راوی کہتا ہے کہ

”اس رات عبید اللہ بن زیاد کے لشکر کا ایک دستہ جو

تیس افراد پر مشتمل تھا امام حسینؑ کے خیمے کے قریب سے گزرا تو انھیں کچھ آوازوں کی گونج سنائی دی۔ لشکری نزدیک آئے کہ دیکھیں کیا بات ہے۔ دیکھا تو دُعا و استغفار کی آواز بلند تھی۔

لَهُمْ دَوِيُّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ .

خیمام حسینؑ سے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز آرہی تھی۔ کوئی رکوع میں تھا اور کہہ رہا تھا سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ وَبِحَمْدِهِ کوئی سجدے میں تھا اور کہہ رہا تھا سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى وَبِحَمْدِهِ کوئی قرآن پڑھ رہا تھا، کوئی اللَّهُ أَكْبَرُ کہہ رہا تھا اور کوئی سُبْحَانَ اللَّهِ۔ لشکری یہ ماجرا دیکھ کر ایسے مسحور ہوئے کہ کہنے لگے کہ ہم سے غلطی ہو گئی، اب ہم ان کا ساتھ دیں گے۔“

مجھے معلوم نہیں اس رات اصحاب حسینؑ کچھ دیر سوئے بھی یا بالکل ہی نہیں سوئے، صبح تک عبادت ہی میں مشغول رہے، اپنے ہتھیار صیقِل کیے، خیموں کی ترتیب بدلی اور ہر لحاظ سے لڑائی کی تیاری مکمل کر لی۔

صبح ہوئی تو امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کے ساتھ فجر کی نماز باجماعت پڑھی اور اس کے بعد ایک مختصر سا خطبہ دیا :

فَحَمِدَ اللَّهُ وَآثَنَى عَلَيْهِ وَقَالَ لِأَصْحَابِهِ
إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ آذَنَ فِي قَتْلِي وَقَتْلِكُمْ الْيَوْمَ .

”اللہ کی حمد و ثنا کے بعد آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ آج اللہ جل شانہ نے مجھے اور تمہیں اس بات کی اجازت دیدی ہے کہ ہم قتل ہو جائیں۔ اب ہمارا کام شہادت حاصل کرنا ہے۔“

ایک دعا بھی منقول ہے جو آپ نے عاشورے کے دن مانگی آپ نے اپنے اللہ سے کہا:

اللَّهُمَّ أَنْتَ ثَقَيْتَ فِي كُلِّ كَرَبٍ وَرَجَائِي فِي كُلِّ
 شِدَّةٍ وَأَنْتَ لِي فِي كُلِّ أَمْرٍ نَزَلَ بِي ثِقَةٌ وَ
 عُدَّةٌ كَرَمٍ مِنْ هَمٍّ يَضْعِفُ فِيهِ الْفؤَادُ وَتَقَلُّ
 فِيهِ الْحِيلَةُ وَيَخْذُلُ فِيهِ الصَّدِيقُ وَتَسْمَتُ
 فِيهِ الْعَدُوُّ أَنْزَلْتَهُ بِكَ وَسَكَّوْتُهُ إِلَيْكَ رَغْبَةً
 مِّنِّي إِلَيْكَ عَمَّنْ سِوَاكَ فَفَرَّجْتَهُ عَنِّي وَ
 كَفَيْتَنِيهِ فَإِنَّتَ وَلِيَّ كُلِّ نِعْمَةٍ وَصَاحِبُ كُلِّ
 حَسَنَةٍ وَمُنْتَهَى كُلِّ رَغْبَةٍ .

”بار الہا! ہر تکلیف میں تجھے ہی پر بھروسہ ہے اور ہر مصیبت میں تجھ ہی سے میری امید وابستہ ہے، ہر معاملے میں جو مجھے پیش آتا ہے تو ہی میرا سہارا ہے خدا یا اکیسی کیسی پریشانیاں مجھے زندگی میں پیش آتیں جن کو میں نے تیرے حوالے کر دیا تو تو نے ان پریشانیوں کو دور کر دیا اور میری مدد کی۔ تو ہی ہر نعمت کا عطا کرنے والا اور ہر بھلائی کا مالک ہے، تو ہی ہر تمنا کا منتہی ہے۔“

دشمن کا ایک سپاہی شب خون مارنے کی نیت سے خمیوں کی پشت کی طرف سے آیا، دیکھا تو راستا بند تھا، راہ نہ پائی تو گالیاں بکنے لگا۔ اصحاب میں سے ایک شخص نے اس کا کام تمام کرنے کی اجازت چاہی۔ آپ نے اجازت نہ دی۔ عرض کیا کہ میں اس شخص کو جانتا ہوں یہ فارسق ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ”میں اپنی طرف سے جنگ کی ابتدا کرنا نہیں چاہتا۔“

چونکہ آپ پوری طرح اتمامِ حجت کرنا چاہتے تھے اس لیے آپ نے عاشورے کے دن پھر لوگوں سے گفتگو کی، کئی خطبے دیے مگر سنگدل دشمن پر ان خطبوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

عمر سعد نے کچھ اور ہی حرکت کی۔ جب دونوں طرف کی صفیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں، اس نے سب سے پہلے ایک تیر چلے پر چڑھایا اور امام حسین علیہ السلام کے اصحاب کی طرف چھوڑ دیا، ساتھ ہی چکار کر کہا کہ ”صاحبو! امیر عبد اللہ کے سامنے گواہی دینا کہ جس نے حسینؑ پر پہلا تیر چلایا تھا وہ میں تھا۔“ عمر سعد کے تیر چلانے کے بعد تیروں کی تڑائی شروع ہو گئی۔ حسینؑ سپاہ میں سے کئی اصحاب گر پڑے۔

اب امام حسینؑ کی رخصتِ آخر کے بارے میں چند جملے بھی سنیں! جب حسینؑ تنہا رہ گئے اور آپ کے سب اصحاب اور جوان شہید ہو گئے تو سب اصحاب کے لاشے ہاتے مبارک امام کی نظروں کے سامنے تھے۔ آپ نے حبیب بن مظاہر، مسلم بن عوسجہ، علی اکبر اور قاسم کے لاشوں کو گرم زمین پر گرتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے طعل شیر خوار اور ابو الفضل عباس

کے لاشوں کو دیکھا۔ صبح سے آپ خود بہت سخت مصروف تھے۔ ایک کوشش آپ کی یہ تھی کہ اپنے اصحاب اور جوانوں کے لاشے ایک ایک کر کے میدان سے اٹھائیں اور ایک مخصوص خیمے میں برابر برابر لٹادیں۔ اس خیمے میں شہید کے برابر شہید تھا مگر دو صاحبان اس قاعدے سے مستثنیٰ تھے، ایک تو آپ کے شیرخوار فرزند علی اصغر اور دوسرے آپ کے سعادت مند بھائی ابوالفضل العباسؑ۔

علی اصغر کو تو شہادت کے بعد آپ نے خیموں کے کنارے دفن کر دیا تھا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ بعد میں ان مقدس اجسام کو پامال کیا جائے گا اور آپ نہیں چاہتے تھے کہ علی اصغر کا نازک جسم گھوڑوں کے سمنوں تلے رونداجائے۔ ابوالفضل العباسؑ کا لاشہ کیوں ایک طرف چھوڑ دیا گیا؟ جب اس کی وجہ سید بحر العلوم سے دریافت کی جاتی تھی تو آپ رونے لگتے تھے اور پھر کہتے تھے کہ ان بزرگ کا لاشہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا، اس لیے حضرت حسینؑ اسے اٹھا کر خیمہ میں نہ لاسکے۔

یہ تھے وہ مناظر جو اُس روز امام حسینؑ کی نظروں کے سامنے تھے۔ جب آپ کے ۷۲ اصحاب اور جوان شہید ہو چکے تو آپ سلامِ آخر کے لیے خیموں کے قریب آ کر نکلائے؛
 لے سکینہ! لے فاطمہ! لے زینب! لے ام کلثوم
 تمہیں میرا سلام پہنچے۔ لے میری بیٹیو! لے میری بہنوا میں

تم سب کو خدا حافظ کہتا ہوں۔ آپ کی بیٹی نے عرض کیا:

يَا اَبَاهُ! اَسْتَسَلَمْتُ لِلْمَوْتِ؟

اباجان! کیا آپ نے موت کے سامنے سپردِ اِلٰہ دی؟

آپ نے فرمایا: بیٹی! جو شخص بے یار و مددگار ہوگا وہ

موت کے سامنے سپردِ انداز نہیں ہوگا تو کیا کرے گا؟

آپ نے ایک دفعہ اور اپنے اہل بیت کو الوداع کہا۔ ہوا یوں کہ آپ نے فرات کے گھاٹ پر حملہ کر کے چار ہزار تیر اندازوں کو پسا کر دیا اور ان کی صفوں کو چیرتے ہوئے گھاٹ پر پہنچ گئے۔ آپ پانی تک پہنچے تو معلوم ہوتا تھا کہ اپنے گھوڑے سے کہہ رہے ہیں: ”لے رہو! میں اُس وقت تک پانی نہیں پیوں گا جب تک تو پانی نہ پی لے۔“ گھوڑا بھی جوش میں تھا اور شاید موج کی نزاکت کو سمجھ رہا تھا، اُس نے سر اٹھا لیا اور پانی نہ پیا۔ اتنے میں ایک شخص صدالگائی کہ حسین! یہاں آپ پانی پینا چاہتے ہیں اور وہاں لشکر آپ کی ساتھی خواتین کے خیموں پر حملہ کرنے والا ہے۔ آپ نے پانی کو تو چھوڑا اور فوراً حرم کے خیموں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ آپ نے دوسری بار اہل بیت کو خدا حافظ کہا۔ انھیں صبر اور حوصلہ سے کام لینے کی ہدایت کی اور حق تعالیٰ کی طرف سے ان سے وعدہ فرمایا کہ انھیں اس کا اجر ضرور ملے گا۔ آپ نے ان سے یہ بھی فرمایا کہ ”اپنے کپڑے پہن لو۔“ مطلب یہ تھا کہ وہ لباس پہن لو جو اسیری کی حالت کے مناسب ہے۔ آپ نے کہا کہ یہ لوگ تمہیں بندی بنا لیں گے۔ پھر فرمایا:

تکالیف اور سختی برداشت کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھو، ویسے مطمئن رہو اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ و نگہبان

ہے وہ تمہیں دشمن کے شر سے نجات دے گا۔ تمہارے
 دشمن طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہوں گے اور اس
 کے بالمقابل تمہیں طرح طرح کی نعمتیں عطا ہوں گی اور
 تمہارے عہد و وقار میں اضافہ ہو گا۔ خیال ہے کہ تمہاری
 زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکلے جو تمہارے وقار کے
 منافی ہو۔

سُبْحَانَ اللَّهِ! یہ کیسا ایمان و ایقان ہے اور اطمینان کی کیا کیفیت
 ہے! اس حالت میں بھی آپ کو یقین ہے کہ اللہ کی طرف سے عہد آپ
 کے لیے ہے اور ذلت دشمن کے لیے۔ آپ خود کو شکست خوردہ نہیں
 سمجھتے بلکہ آپ کو یقین ہے کہ آخر میں ہار دشمن ہی کی ہوگی۔ اس دفعہ
 آپ نے آخری بار اہلبیت کو الوداع کہا اس کے بعد آپ وہاں سے
 تشریف لے گئے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

راوی کہتا ہے :

”فَوَاللَّهِ مَا رَأَيْتُ مَكْسُورًا قَطُّ قَدْ قُتِلَ

وُلْدُهُ وَ أَهْلُ بَيْتِهِ وَ أَصْحَابُهُ أَرْبَطَ جَأَشًا مِنْهُ

میں نے کبھی کسی شکست خوردہ کو نہیں دیکھا کہ

اس کے بچے، اہل خاندان اور دوست احباب اس کی

آنکھوں کے سامنے قتل ہو گئے ہوں اور اس کے باوجود

وہ اس قدر باحوصلہ ہو۔“

ایسی حالت میں آپ نے شیر کی طرح دشمن پر حملہ کیا تو دشمن کے آدمی

بھیڑوں کی طرح بھاگتے نظر آئے۔ آپ نے ایک جگہ کو اپنا مرکز قرار دے لیا

تھا، حملے کے بعد آپ اسی جگہ تشریف لے آتے تھے۔ یہ جگہ خیموں سے اتنی
 نزدیک تھی کہ وہاں سے آپ کی آواز خیموں تک پہنچ سکتی تھی۔ آپ اپنے
 مرکز سے زیادہ دُور نہیں جاتے تھے اور حَرَم کے خیموں پر مسلسل نگاہ رکھے
 ہوتے تھے۔ جب آپ اپنے مرکز میں پہنچ جاتے تھے تو بہ آواز بلند ایک نعرہ
 اس طرح لگاتے تھے کہ اہل بیت سن سکیں۔ آپ کا نعرہ ہوتا تھا:

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ .

یعنی ہر حرکت اور ہر طاقت اللہ ہی کی طرف سے
 ہے۔ اگر میں لڑتا ہوں تو خدا کی دی ہوئی طاقت سے اگر
 صُبر کرتا ہوں تو اسی کی دی ہوئی توفیق سے۔ اور اگر شکر
 کرتا ہوں تو وہ بھی خدا ہی طرف سے ہوتا ہے۔ غرض جو
 کچھ ہے خدا کی طرف سے ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ آپ کس طرح اپنی خُشک زبان کو خُشک مُنہ
 میں گھماتے پھراتے ہوں گے۔ ظاہر ہے نعرہ لَّا حَوْلَ لَاحِقِیْ بھی بڑی مشکل سے
 لگا رہے ہوں گے۔

فَوَقَّفَ لَيْسْتَ رَبِّحَ سَاعَةً .

پھر آپ نے ذرا سا توقف فرمایا کہ کچھ آرام کریں۔
 اتنے میں ایک شخص نے آپ کی پیشانی مبارک پر ایک پتھر مارا۔
 پیشانی سے خُون جاری ہو گیا، آپ نے چاہا کہ اپنے کپڑے سے خُون صاف
 کر دیں، اسی وقت ایک اور شخص نے آپ کے سینہ پر ایک زہر لُود تیر
 تاک کر مارا۔ آپ نے فرمایا: بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلَىٰ مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ .

یادداشت
